فکرِ و عقیدہ کی گمراہیاں
اور
صراطِ مستقیم کے تقاضے

شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ

فکر و عقیدہ کی گمراہیاں
اور
صراطِ مستقیم کے تقاضے

© مكتبة دارالسلام ١٤٢٧ هـ
فهرسة مكتبة الملك فهد الوطنية أثناء النشر
ابن تيمية، احمد بن عبدالحليم
اقتضاء الصراط المستقيم باللغة الاردية / احمد بن عبدالحليم ابن تيمية - الرياض، ١٤٢٧هـ
ص: ٢٧٥ مقاس: ١٤×٢١ سم
ردمك: ٠-٧-٩٨٢٢-٩٩٦٠
١-البدع في الاسلام أ-العنوان
ديوي ٢١٢،٣ ١٤٢٧/٥٦٢٤
رقم الإيداع: ١٤٢٧/٥٦٢٤
ردمك: ٠-٧-٩٨٢٢-٩٩٦٠

www.KitaboSunnat.com

سعودی عرب (ہیڈ آفس)

پوسٹ بکس: 22743 الریاض: 11416 سعودی عرب فون: 4043432-4033962 1 00966 فیکس: 4021659
E-mail: darussalam@awalnet.net.sa - riyadh@dar-us-salam.com
Website: www.darussalam.com

● طریق مکہ۔ العلیا۔ الریاض فون: 4614483 1 00966 فیکس: 4644945 ● الملز۔ الریاض فون: 4735220 فیکس: 4735221
● سویلم فون: 2860422 1 00966 ● جدہ فون: 6879254 2 00966 فیکس: 6336270
● مدینہ منورہ موبائل: 503417155 00966 فیکس: 8151121 ● خمیس مشیط فون: 2207055 7 00966 موبائل: 0500710328
● الخبر فون: 8692900 3 00966 فیکس: 8691551 ● ینبع البحر موبائل: 0500887341

شارجہ فون: 5632623 6 00971 **امریکہ** ❶ ہیوسٹن فون: 7220419 713 001
لندن فون: 4885 539 208 0044 ❷ نیویارک فون: 6255925 718 001

پاکستان (ہیڈ آفس و مرکزی شوروم)

❶ 36- لوئر مال، سیکرٹریٹ سٹاپ، لاہور
فون: 7110081-7111023-7232400-7240024 42 0092 فیکس: 7354072
Website: www.darussalampk.com E-mail: info@darussalampk.com
❷ غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور فون: 7120054 فیکس: 7320703 ❸ موَن مارکیٹ اقبال ٹاؤن لاہور فون: 7846714

کراچی شوروم Z-110,111 (D.C.H.S) مین طارق روڈ کراچی
فون: 4393936-21-0092 فیکس: 4393937 Email: darussalamkhi@darussalampk.com

اسلام آباد شوروم F-8 مرکز، اسلام آباد فون: 051-2500237

تالیف:
شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ
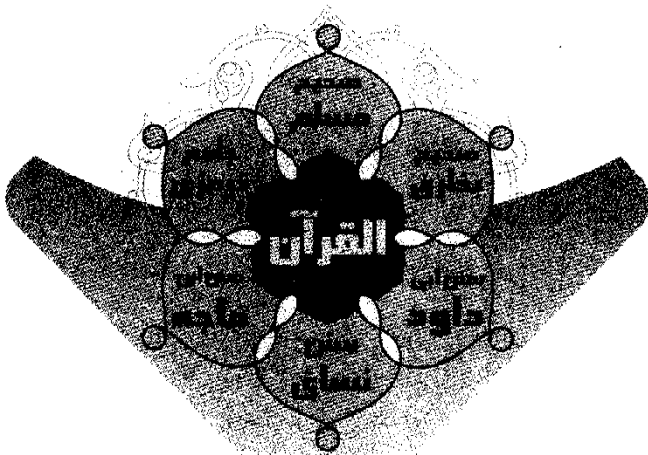
اردو قالب:
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

نامِ کتاب : فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراطِ مستقیم کے تقاضے

مصنّف : شیخ الاسلام امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ

منتظمِ اعلیٰ : عبدالمالک مجاہد

مجلسِ انتظامیہ : حافظ عبدالعظیم اسد (مینجر دارالسلام لاہور) محمد طارق شاھد

مجلسِ مشاورت : حافظ صلاح الدین یوسف ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر پروفیسر محمد یحییٰ مولانا محمد عبدالجبار

ڈیزائننگ اینڈ السٹریشن : زاھد سلیم چودھری (آرٹ ڈائریکٹر)

خطاطی : اکرام الحق

اشاعت اوّل : 2007

مضامین

فصل: 3

فصل: 4

فصل:5

فصل: 6

فصل: 7

فصل:8

فصل:9

فصل:10

فصل:11

فصل: 16

فصل: 17

فصل: 18

فصل: 19

فصل: 20

فصل:21

فصل:22

فصل:23

فصل:24

فصل:25

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت رحم کرنے والا خوب مہربان ہے

عرض ناشر

قرآن وسنت کی خالص تعلیمات کی اشاعت دارالسلام کا مطمحِ نظر ہے، اس لیے کسی بھی کتاب کو شائع کرنے سے قبل میں یہ اطمینانِ قلب حاصل کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں دینِ اسلام کی خدمت اور امت محمدیہ کی فلاح کا تناسب کس قدر رہے گا۔ یہی میرا پیمانۂ اشاعت اور یہی نصب العین ہے۔ اَلْحَمْدُلِلّٰہ! جس قدر کتب شائع کرنے کی سعادت، اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے، شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے نصب العین اور مطمحِ نظر سے سرمو انحراف نہیں کیا اور اس بات کی گواہی مجھے اپنی کتب کی اکنافِ عالم میں طلب سے ملتی رہتی ہے۔

زیر نظر کتاب امام احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم'' کا ترجمہ وتلخیص ہے جو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی رحمہ اللہ کی کاوش ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ساتویں صدی ہجری کے عظیم مجدد تھے۔ یہ وہ دور تھا جب دین کی راہیں شرک وبدعات کی تاریکیوں میں گم ہونے لگی تھیں اور معاشرے میں فواحش ومنکرات کا زور تھا۔ صوفیوں نے قرآن وحدیث کو تبرک حاصل کرنے تک محدود کر دیا تھا اور سارے کا سارا دین قبروں کی زیارت، ان کے ساتھ عقیدت واحترام اور چڑھاوے چڑھانے تک محدود ہو گیا تھا۔ عرسوں اور میلوں ٹھیلوں کو دین کا حصہ بنا دیا گیا تھا۔ غیر مسلموں کے

تہواروں میں شرکت اور ان کو اپنے تہواروں میں دعوت دینا معمول بن گیا تھا۔ انھی پُرآشوب حالات میں شیخ نے ''اقتضاء الصراط المستقیم'' لکھی جس میں ان تمام خرافات کا قرآن وسنت کی روشنی میں رد کیا۔

دنیائے عرب میں اس گرانقدر کتاب کے متعدد مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان مخطوطات کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، لیکن سب سے زیادہ شہرت اور قبولیت مصر کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد حامد الفقی کی اشاعت کو حاصل ہوئی، جس کا ترجمہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی رحمہ اللہ نے کیا اور ساتھ ہی ایک دقیق مقدمہ بھی تحریر کیا۔ یہ ترجمہ سب سے پہلے کلکتہ کی ہند بک ایجنسی نے بنام ''صراط مستقیم'' شائع کیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت لاہور میں بنام ''جادۂ حق'' شائع ہوئی۔ کتاب ہٰذا اسی ترجمے کی جدید اشاعت ہے۔ ترجمے میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی نہیں کی گئی، تاہم متروک اردو الفاظ کو جدید الفاظ سے بدل دیا گیا ہے اور زبان و بیان کے سقم دور کرنے کے ساتھ ساتھ کمپوزنگ اور پروف کی صحت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ہم نے کتاب کے عنوان کو عام فہم بنانے کے لیے اس کا نام ''فکر وعقیدہ کی گمراہیاں اور صراط مستقیم کے تقاضے'' رکھ دیا ہے۔ نئے ایڈیشن کی تسہیل، پروف ریڈنگ اور آخری مراحل سے گزارنے کی ذمہ داری مولانا محمد عثمان منیب اور مولانا منیر احمد رسولپوری نے انجام دی ہے جبکہ اس ایڈیشن کی تحقیق وتخریج کی نازک ذمہ داری ابوالقاسم حافظ محمود تبسم حفظہ اللہ نے نبھائی۔ اس کے فنی مراحل ڈیزائننگ اور کمپوزنگ وغیرہ میں جناب زاہد سلیم چودھری، محمد عامر رضوان، ہارون الرشید اور ابومصعب نے اسے خوب سے خوب تر بنانے میں بھرپور محنت کی ہے جس سے کتاب کی استنادی حیثیت میں مزید اضافہ ہوا اور اس کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

اس گراں قدر کتاب کو معیاری بنانے میں ہم کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، اس کے

لیے قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت شیخ الاسلام، مترجم اور میرے شریک کار ساتھیوں کو جزائے خیر سے نوازے جن کی محنت سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

خادم قرآن وسنت

عبدالمالک مجاہد

مدیر : دارالسلام - الریاض، لاہور

رجب 1427، اگست 2006ء

مقدمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُولِهِ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ الطَّيِّبِينَ

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے مجھے امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کے معارف وعلوم کو نقل کرنے اور ان کا اردو ترجمہ کرنے کی توفیق بخشی، اس خدمت کو قبول عام سے نوازا اور مسلمانوں کے عقائد واعمال کو اس سے مستفید فرمایا۔ اس نعمتِ عظیم پر مسرت وشکر گزاری اور اقرار واظہار کے ساتھ اپنی گزشتہ کئی سالوں کی خاموشی اور اس خدمت سے دوری پر متأسف اور قارئین سے عفوودرگزر کا طالب ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کتنی سخت مجبوریاں درپیش تھیں، ورنہ خدمت میں اتنی تعویق وتاخیر نہ ہوتی۔

مغربی الحاد

اس وقت برصغیر میں ہر طرف مغربی الحاد کا رونا رویا جا رہا ہے اور اس سیلاب میں اسلام کے بہہ جانے کا خطرہ محسوس کیا جا رہا ہے، لیکن کیا واقعی اسلام کو آج بھی مغربی خیالات سے کوئی خطرہ لاحق ہے؟ میرے خیال میں بالکل نہیں۔ اسلام کو آج تک بیرونی قوتوں سے، خواہ وہ مادی ہوں یا ذہنی، نقصان نہیں پہنچا اور نہ آئندہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ دینِ فطرت ہے اور اس

کی بنیادیں حق کی ٹھوس چٹان پر قائم ہیں۔ البتہ جو کچھ نقصان پہنچ چکا ہے اور جس کا آئندہ اندیشہ ہے، وہ اندرونی فساد ہے نہ کہ بیرونی حملہ۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ خود ہی اسلام کے دشمن بنے اور اپنے ہی ہاتھوں اس کی عمارت ڈھاتے رہے ہیں۔ خود نبیٔ اکرم ﷺ نے اس بدنصیبی کی پیشین گوئی کر دی تھی جو امام مسلم اور اصحاب سنن نے روایت کی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین سمیٹ دی اور میں نے اس کا مشرق و مغرب سب دیکھ لیا۔ میری امت کی سلطنت وہاں تک پہنچے گی جہاں تک زمین مجھے دکھائی گئی ہے مجھے سرخ اور سفید (سونا چاندی) دونوں خزانے بخش دیے گئے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کرے اور اس پر خود اس کے اپنے سوا، کسی اور کو مسلط نہ کرے جو اس کا ملک اس سے چھین لے۔'' اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ''اے محمد (ﷺ)! جب میں فیصلہ کر دیتا ہوں تو وہ ٹالا نہیں جا سکتا۔ میں نے تیری التجا منظور کر لی کہ تیری امت کو قحط سے ہلاک نہیں کروں گا اور اس پر خود اس کے اپنے سوا کسی کو مسلط نہیں کروں گا جو اس کا ملک اس سے چھین لے، اگرچہ ساری دنیا بھی اس ارادے سے اس کے خلاف جمع ہو جائے یہاں تک کہ تیری امت خود باہم ایک دوسرے کو ہلاک کرنے اور قید کرنے لگ جائے۔''[1]

علمائے سوء اور مدعیان تصوف

علمائے سوء کا جمود، تقلید اور دین فروشی اور داعیانِ تصوف کا شرک و بدعت اور نفس پرستی۔

---

[1] صحيح مسلم، الفتن، باب هلاك هذه الأمة بعضهم ببعض، حديث:2889 وسنن أبي داود، الفتن، باب ذكر الفتن ودلائلها، حديث:4252

یہی وہ جراثیم ہیں جنھوں نے اسلام کو اس حال میں کر دیا ہے کہ اسے پہچاننا مشکل ہو گیا ہے اور مسلمانوں کی حالت ایسی بنادی ہے کہ ننگ انسانیت وشرافت اور مضحکہ اقوام وملل ہو گئے ہیں۔

اصل خطرہ

طویل غور وخوض کے بعد پوری دیانت داری اور ذمہ داری کے ساتھ میں اپنے اس یقین کا بے خوف وخطر اعلان کرتا ہوں کہ مغربی افکار سے اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، البتہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی جس چیز سے مکمل ہو رہی ہے وہ صرف علمائے سوء اور نام نہاد صوفیوں کے فتنے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم میں اخلاص کی بہت کمی واقع ہو گئی ہے اس لیے سرداری کے بھوکے چالاک لوگ، مغربی افکار کے موہوم خطرات سے مصنوعی جنگ میں مصروف ہو گئے ہیں، حالانکہ اس فرضی جنگ سے اسلام کو مطلقاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا البتہ ان اشخاص کو اس سے ذاتی فوائد ضرور حاصل ہو رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہوتا تو اس بازی گری کو چھوڑ کر جمود وتقلید اور شرک وبدعت کے خلاف اعلان جنگ کر دیتے، جس سے واقعتاً اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت ہو سکتی، مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔

جھوٹی سرداری کے طلب گاروں سے مجھے کوئی سروکار نہیں، لیکن جو لوگ سچا اسلامی درد رکھتے ہیں اور حقیقی اصلاح چاہتے ہیں، ان سے میں مکمل ناصحانہ اور خیر خواہانہ انداز کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ خود غرضوں کے شور وغل سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لیے کوئی بیرونی مہلک خطرہ درپیش نہیں ہے، البتہ وہ اندرونی خطرہ ہے جو تمام سابقہ بربادیوں کا اصل سرچشمہ ہے اور اگر اسے اب بھی رفع نہ کیا گیا تو عنقریب یہ مکمل تباہی اور بربادی کا باعث بنے گا۔

بہترین تدبیر

میرے علم ودانست میں اس اندرونی خطرے کا مقابلہ جن ہتھیاروں سے کیا جاسکتا ہے ان میں ایک نہایت کارگر ہتھیار شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کی مسلمانوں میں اشاعت ہے۔ اسلام کی پوری علمی واصلاحی تاریخ میں ان کے مانند دلیری وکامیابی سے کسی شخص نے شرک وبدعت کا مقابلہ نہیں کیا۔ وہ صحیح معنوں میں مجدِّد تھے اور بلا مبالغہ انھوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت از سرِنو قائم کر دی۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی عظمت

اس حقیقت کا اعتراف مسلمان مؤرخین ہی نے نہیں، یورپین مستشرقین نے بھی کیا ہے۔ جرمن اسکالر[1] لکھتا ہے:

''اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جو عظیم الشان تحریک امام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) سے شروع ہوئی اور جس میں اسلام کے اصلی وحقیقی رجحانات پوری طاقت سے ظاہر ہوئے، اس نے ان کثیر اندرونی وبیرونی خطروں کے مقابلے میں اسلام کی خود اعتمادی کا زبردست ثبوت پیش کیا ہے جو تیرہویں صدی عیسوی میں اسلام کے وجود کو لاحق تھے۔ صلیبی جنگوں اور ان سے بھی زیادہ تاتاری یلغاروں نے مسلمانوں کی قوت کو مفلوج اور ان کی خود اعتمادی کو بہت مضمحل کر دیا تھا۔ اشعری اصول وعقائد کارآمد

---

[1] Von Kremer Alfred نامی جرمن اسکالر جو 1828ء میں پیدا ہوا اور 1889ء میں وفات پا گیا۔ اس نے جرمن زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا نام Cultur Geschichtliche Streizuge ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ صلاح الدین بخش بیرسٹر نے Contribution to the History of Civilization کے نام سے کیا۔

نہیں ہو سکتے تھے۔ صوفیوں کا عقیدہ ہر لحاظ سے مسلمانوں کے اخلاق کو کمزور کرنے والا ثابت ہوا تھا۔ اسلامی دنیا میں ولی پرستی، محمد (ﷺ) کی تعلیمات کے ساتھ لگاتار متصادم تھی۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کا ظہور اور توحید کا اعلان، جس کے وہ علمبردار تھے، ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ ہم یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ اپنی دعوت کی ذمہ داریاں اٹھانے کی پوری اہلیت رکھتے تھے۔ وہ بڑے ہی پر جوش و سرگرم تھے۔ انھوں نے بڑی مردانگی کے ساتھ اپنے عقائد کا اعلان کیا، ایسا اعلان جو عظیم خیالات کے زیر اثر انسان ہی سے ممکن ہے۔"

یہی اسکالر ایک دوسری جگہ لکھتا ہے:

"اسلام، رومن کیتھولک مسیحیت کی طرح ہو گیا تھا مگر ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) نے اس کی ازسرنو تجدید کر دی۔"[1]

مسلمان مصنفین میں خصوصیت کے اعتبار سے جو امتیاز شیخ الاسلام کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ان کے مباحث جدّت اور زندگی سے لبریز ہیں۔ طریق استدلال از حد دل نشین اور معقول ہے۔ دل و دماغ کو بیک وقت متاثر کرتا ہے، چونکہ وہ علم کا بحر زخّار ہیں اس لیے ہر مسئلے پر فیصلہ کن بحث کرتے ہیں اور مخاطب قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اصلاحی تحریک

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اصلاحی تحریک کا اصل مقصد یہی تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کو علمائے سوء کے جمود و تقلید اور مدعیان تصوف کے شرک و بدعت سے نجات دلائی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیشتر تصانیف کا موضوع بحث یہی چیزیں ہیں اور حق یہ ہے کہ انھوں نے دونوں

[1] Contribution to the History of the Civilization.

فتنوں پر بہت ہی زبردست ضربیں لگائی ہیں۔ افسوس! ان کی زندگی کا زیادہ حصہ قید خانے میں گزرا، ورنہ قوی امید تھی کہ وہ ان فتنوں کا بالکل قلع قمع کر ڈالتے۔ اس سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کے بعد کوئی ان جیسا صاحبِ عزم پیدا نہ ہوا جو توحید کا پرچم برابر بلند رکھتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بتدریج ان کی تعلیمات سے غافل ہو گئے، حتیٰ کہ ان کی متعدد تصانیف بھی ضائع ہو گئیں جن میں سب سے اہم تفسیر القرآن تھی۔ یہی نہیں بلکہ عاقبت نا اندیش لوگوں نے خود اس علمبردارِ توحید اور دشمنِ شرک و بدعت کی قبر پر پرستش شروع کر دی۔

اُمید کی کرن

لیکن یہ واقعہ مسلمانوں کی مایوس کن حالت میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امید دلا رہا ہے کہ صدیوں گمنام رہنے کے بعد جب سے شیخ الاسلام کی تصانیف شائع ہونا شروع ہوئی ہیں، تمام اسلامی ممالک میں ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ یہ خیر مقدم زیادہ تر اس جدید طبقے کی طرف سے کیا جاتا ہے جو مغربی افکار سے متاثر ہو کر جمود و تقلید کے چنگل سے آزاد ہو چکا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی خیالات مسلمانوں کے لیے فتنہ ثابت ہونے سے زیادہ رحمت ثابت ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی قباحتیں اور مفاسد بیان کیے جائیں، مگر ان کے اس فائدے سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عقل کو جمود و تقلید کی بندشوں سے آزاد کر دیتے ہیں اور یہ بات واضح ہے کہ عقل کی آزادی ہی اصلاح کی اولین شرط ہے۔ بلاشبہ یہ خیالات علمائے سوء اور بدعتی صوفیوں کے اسلام کے لیے حقیقی خطرہ ہیں، یعنی اس اسلام کے لیے جو صرف تقلید و جہل کی ظلمتوں ہی میں زندہ رہ سکتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے اسلام کو ان سے کوئی خطرہ نہیں بشرطیکہ اسے اس کی حقیقی صورت میں نئی نسلوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تصانیف کی اشاعت سے یہ مقصد بھی پورا ہو سکتا ہے۔

اہل حدیث

بعض مسلمان طرح طرح کی گمراہیوں اور بے راہ روی میں مبتلا ہیں۔ صرف ایک جماعت اہل حدیث ہی صحیح اسلام پر استوار ہے، مگر بدقسمتی سے اس میں بھی فساد آ گیا ہے۔ یہ جماعت صحیح عقائد بھی رکھتی ہے اور صحیح اعمال بھی، لیکن ایک طرف افراط وتفریط میں مبتلا ہوگئی ہے اور دوسری طرف ایک اہم ترین فریضۂ دین سے غافل ہو چکی ہے۔

اہم ترین فریضۂ دین جس سے یہ جماعت غافل ہوگئی ہے، وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک جہاد نہ کیا جائے یا کم ازکم اس کا پختہ عزم نہ رکھا جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ بارہ ہزار سچے مسلمانوں پر دنیا کی کوئی قوت غالب نہیں آسکتی [1] لیکن لاکھوں کی تعداد میں اہل حدیث موجود ہیں مگر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ وجہ یہی ہے کہ فریضۂ جہاد کے عمل وارادے سے ان کے دل غافل ہوگئے ہیں۔

میں پھر کہتا ہوں کہ صرف جماعت اہلِ حدیث ہی حقیقی اسلام پر قائم ہے۔ اور اگر یہ دونوں فساد دور کردیے جائیں تو اسلام کو پھر سے عروج حاصل ہوسکتا ہے۔ بلاشبہ اہل حدیث نجد، فریضۂ جہاد ادا کر رہے ہیں۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ اپنے عہد کے بہت بڑے مجاہد تھے۔ مصر میں تاتاری یلغار صرف انھی کی اولوالعزمی سے ناکام رہی۔ ان کی تصانیف مجاہدانہ روح سے لبریز ہیں اور ان کی اشاعت سے مسلمانوں کے دلوں میں گرمی پیدا کی جاسکتی ہے۔

---

[1] سنن أبی داود، الجهاد، باب فی مایستحب من الجیوش والرفقاء والسرایا، حدیث: 2611 وجامع الترمذی، السیر، باب ما جاء فی السرایا: 1555۔ اس حدیث کو امام حاکم نے صحیح قرار دیا ہے، امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے اور امام ترمذی نے بھی اسے حسن کہا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر میں نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے شیخ الاسلام کی تصانیف کے اردو ترجمے کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔

صراط مستقیم

''صراط مستقیم'' شیخ الاسلام رحمہ اللہ کی جلیل القدر کتاب ''اقتضاء الصراط المستقیم فی مخالفة أصحاب الجحیم'' کا اختصار ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ جرمن اسکالر بھی، جو بالکل غیر جانبدار ہے، اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) کی یہ کتاب مسلمانوں کی زندگی کے وہ تمام پہلو بڑی خوبی سے روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دیتی ہے جو مشرکانہ و بت پرستانہ ہیں۔''[1]

''صراط مستقیم'' میں میں نے اس کتاب کے وہ مباحث جمع کر دیے ہیں جو عصر حاضر میں مسلمانوں کے لیے ضروری ہیں۔ یہ مباحث اصل کتاب میں نہایت مفصل موجود ہیں اور یہاں دیباچے میں کسی مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ لیکن اصولاً تنبیہ ضروری ہے۔

کفار کی عیدیں

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے ثابت کر دیا ہے کہ کفار کی عیدوں، تہواروں اور میلوں میں مسلمانوں کی شرکت کسی حیثیت سے بھی روا اور جائز نہیں مگر اس سے غلط فہمی میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اس حکم میں وہ تقریبات داخل نہیں ہیں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مشترک وطنی مصائب یا مسرتوں کی یادگار کے طور پر منائی جاتی ہیں۔ ان تقریبات اور محافل کا دینی عقائد سے کوئی تعلق

---

[1] Contribution to the History of the Civilization.

نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ سراسر دنیاوی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ①

عبدالرزاق ملیح آبادی

(کلکتہ)

① اسلام میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق ہے نہ انسانی زندگی کا کوئی مسئلہ اسلامی حدود سے متجاوز ہے فرق صرف راہنمائی کا ہے۔ عبادات میں حرمت اصل ہے (یعنی جس کا شریعت میں حکم موجود نہ ہو وہ کام نہیں کر سکتے۔) معاملات میں اباحت (جواز) اصل ہے یعنی جس کام پر شریعت نے پابندی نہ لگائی ہو وہ کر سکتے ہیں۔ ایسے ایام اور ان پر ہونے والے امور کا اسی اصول کے تحت جائزہ لیں گے کہ وہ اسلامی منہیات سے متصادم تو نہیں ہیں۔

فصل 1

کفار کی عیدیں اور تہوار

کفار کی عیدیں اور تہوار بہت ہیں۔ مسلمان پر ان کی تحقیق واجب نہیں، صرف اس قدر واقفیت کافی ہے کہ فلاں کام کفار کا ہے، فلاں دن یا فلاں جگہ کی تعظیم کفار کی طرف سے ہے، اگر یہ بھی معلوم نہ ہو تو اس قدر واقفیت کافی ہے کہ اس خاص کام یا دن یا جگہ کی تعظیم اسلام میں نہیں ہے بلکہ لوگوں نے اسے اپنی طرف سے بنالیا یا کفار سے اخذ کرلیا ہے۔ لہٰذا اس کا حکم کم از کم یہ ہوگا کہ یہ بدعت ہے۔

ہم یہاں اس قسم کی بعض بدعتوں کا ذکر کرتے ہیں جن میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔ ایک عید عشائے ربانی ہے۔ یہ عید عیسائیوں کے روزوں کے آخر میں ہوتی ہے اور ان کے خیال میں یہ اس مائدہ (دسترخوان) کی یادگار ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر آسمان سے اترا تھا۔ اس عید میں بہت سے بُرے کام کیے جاتے ہیں، مثلاً: عورتوں کا بازاروں میں بے پردہ نکلنا، قبروں پر اگر بتیاں جلانا، چھت پر کپڑے پھیلانا، کاغذ لکھ کر دروازوں پر چسپاں کرنا، ان دنوں میں بخور خریدنا، بیچنا اور سلگانا اور اسے ثواب کا ذریعہ سمجھنا وغیرہ۔

بخور جلانے کو عبادت سمجھنا نصاریٰ اور صابئین کا دین ہے، مسلمانوں کا نہیں۔ بخور بھی مشک وعود کی طرح ایک خوشبو ہے۔ اس کا دھواں سونگھا جاتا ہے اور دوسری خوشبوؤں کی طرح اس کا استعمال بھی مباح ہے مگر اسے عبادت قرار دینا جائز نہیں۔ اسی طرح اس عید کے موقع پر دودھ میں چاول پکانا، گھی میں تلنا، کھچڑی تیار کرنا، انڈے رنگنا، انڈوں پر جوا کھیلنا، قمار بازوں

کے ہاتھ انڈے بیچنا یا ان سے خریدنا، اس قسم کے تمام افعال جو اس موقع پر کیے جاتے ہیں، تمام کے تمام بدعت ہیں۔

اسی طرح اس عید میں کسانوں کا اپنے مویشیوں یا درختوں پر لال نشان بنانا، خاص قسم کے کپڑے جمع کرنا، ان سے برکت حاصل کرنا، ان کو دھو کر ان سے نکلنے والے پانی سے نہانا یا عورتوں کا زیتون کی پتیاں جمع کرنا اور ان کے پانی سے غسل کرنا، روزمرہ کے کام کاج چھوڑ دینا، مثلاً دکانیں اور مدارس بند کر دینا اور عام تعطیل کر کے خوشی منانا، یہ سب کے سب کام بدعت ہیں۔[1]

ضابطہ

اس سلسلے میں ضابطہ یہ ہے کہ کفار کی عیدوں میں مسلمانوں کو خصوصیت سے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو وہ دوسرے دنوں میں نہ کرتے ہوں بلکہ ان دنوں کو بھی باقی دنوں کی طرح سمجھنا چاہیے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ان خاص دنوں میں صحابۂ کرام کو کھیل اور تفریح سے منع کیا تھا جن میں اسلام سے پہلے عرب کھیل کود کرتے تھے۔[2] اسی طرح اس خاص جگہ جانور ذبح کرنے سے روکا تھا، جہاں مشرکین اپنی عید مناتے تھے۔[3]

---

① اسی طرح برصغیر کے مسلمانوں کا دیوالی میں اپنے گھروں کی صفائی کرنا، بچوں کا گھروندے بنانا، کھیل کھیلنا اور مٹھائیاں خریدنا ہولی میں رنگ کھیلنا، کرسمس میں ایک دوسرے کو پھول وغیرہ پیش کرنا اور سیر و تفریح کے لیے نکلنا بدعت کے کام ہیں۔

② سنن أبی داود، الصلاة، باب صلاة العیدین، حدیث:1134 و سنن النسائی، صلاة العیدین، باب:1، حدیث : 1557 و مسند أحمد:250,235,178,103/3۔ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

③ سنن أبی داود، الأیمان والنذور، باب مایؤمر به من وفاء النذر، حدیث:3313۔ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

اسی طرح موسم سرما میں دسمبر کی 25 تاریخ کو لوگ بہت سے کام کرتے ہیں۔ عیسائیوں کے خیال میں یہ دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہے۔ اس میں جتنے بھی کام کیے جاتے ہیں، مثلاً آگ روشن کرنا، خاص قسم کے کھانے تیار کرنا، موم بتیاں جلانا وغیرہ، سب کے سب مکروہ ہیں۔ اس دن کو عید سمجھنا عیسائیوں کا دین وعقیدہ ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی اصلیت نہیں۔ سلف صالحین کے عہد میں اس تہوار کا مطلقاً کوئی تذکرہ نہیں ملتا بلکہ بعد کے مسلمانوں نے اسے عیسائیوں سے اخذ کرلیا ہے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بپتسمہ کی یاد میں عیسائی ''عید غطّاس'' کے نام سے ایک عید مناتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی بہت سی جاہل مسلمان عورتیں بھی اپنے بچوں کو حماموں میں نہلاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ یہ غسل بچوں کے لیے بہت مفید ہوتا ہے، حالانکہ یہ اعتقاد عیسائیوں کا ہے اور مسلمانوں کے لیے نہایت مکروہ اور حرام ہے۔ یہی حکم مجوسیوں کی عیدوں، نوروز اور مہرجان وغیرہ کا ہے اور اسی حکم میں دوسرے تمام کفار کی عیدیں داخل ہیں۔

بدعتی عیدیں، تہوار اور میلے

اس سلسلے میں وہ تمام عیدیں، تہوار اور میلے داخل ہیں جو بدعت کے پیدا کردہ ہیں، یہ سب کے سب منکر اور مکروہ ہیں خواہ ان کی کراہت تحریمی ہو یا غیر تحریمی۔ اہلِ کتاب اور کفار کے تہوار منانے اور میلوں میں شریک ہونے کی ممانعت کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں کفار کی مشابہت ہے اور دوسرا یہ کہ وہ بدعت ہیں۔

لہٰذا تمام میلے اور عیدیں جو بدعت کی راہ سے پیدا ہوئی ہیں، اسی حکم میں داخل ہیں خواہ ان میں اہلِ کتاب کی مشابہت نہ بھی ہو۔

محکم قاعدہ

صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ان پر صادق آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے تو فرماتے:

''اَمَّا بَعْدُ! سب سے اچھی گفتگو کتاب اللہ ہے، سب سے اچھا راستہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے، بدترین کام بدعت کے کام ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1] سنن نسائی کی روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے: ''اور ہر گمراہی دوزخ میں (لے جاتی) ہے۔''[2]

---

[1] صحیح مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة، حدیث:867

[2] سنن النسائی، صلاة العیدین، باب کیف الخطبة، حدیث: 1579۔ اس کی سند صحیح ہے۔

نیز صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو کوئی ہمارے طریقے سے الگ کام کرے، وہ کام مردود ہے۔''[1]

اور صحیحین کی ایک روایت میں ہے:

''جو کوئی ہمارے طریقے میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے۔''[2]

اور اصحابِ سنن نے حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے بطریق صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے جو کوئی میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت اختلاف دیکھے گا تو تم میری سنت اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت کو لازم پکڑنا، اسی کی پابندی کرنا اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑنا۔ اور خود کو بدعت کے کاموں سے بچائے رکھنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔''[3]

یہ ایک محکم قاعدہ ہے جو سنت رسول اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ نیز قرآن کریم میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

① اسے امام بخاری نے اپنی ''الصحیح'' میں معلق ذکر کیا ہے دیکھیے: (صحیح البخاری، الاعتصام، باب إذا اجتهد العامل أو الحاكم ......الخ) یہ روایت ترجمۃ الباب میں مذکور ہے۔ البتہ امام بخاری نے اسے اپنی کتاب ''خلق أفعال العباد'' میں صفحہ نمبر 43 پر موصول ذکر کیا ہے۔ (صحیح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة ......الخ، حدیث: 1718)

② صحیح البخاری، الصلح، باب إذا اصطلحوا على صلح جور ......الخ، حدیث: 2697 و صحیح مسلم، الأقضية، باب نقض الأحكام الباطلة...... الخ، حدیث: 1718

③ سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حدیث: 4607 و جامع الترمذی، العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة، حدیث: 2676۔ اس کی سند صحیح ہے۔

﴿أَمۡ لَهُمۡ شُرَكَٰٓؤُاْ شَرَعُواْ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمۡ يَأۡذَنۢ بِهِ ٱللَّهُۚ﴾

”کیا ان لوگوں نے اللہ کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنھوں نے وہ احکام دین مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔“ [1]

خود ساختہ دین

پس جو کوئی کسی ایسی بات کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھے، اس کی طرف بلائے اور اپنے قول یا فعل سے اس چیز کو واجب بتائے جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں کیا تو درحقیقت وہ ایک ایسا دین بنا رہا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی اور جو کوئی اس کی پیروی کرتا ہے تو وہ دراصل اس ایجاد کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رہا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ایک نیا دین ایجاد کر رہا ہے۔

البتہ نئی بات ایجاد کرنے والے نے اگر کسی تاویل کی بنا پر ایسا کیا ہے تو اس کی مغفرت ہو جائے گی، بشرطیکہ اس کی تاویل کسی ایسے اجتہاد پر مبنی ہو جس میں غلطی معاف ہو جاتی ہے اور اس صورت میں اسے اپنے اجتہاد پر ثواب بھی حاصل ہو گا لیکن اس کی پیروی کسی حال میں بھی روا اور جائز نہیں ہو سکتی۔ اس طرح ہر شخص کے قول یا عمل کا اتباع جائز نہیں جس کی غلطی معلوم ہو جائے، کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ٱتَّخَذُوٓاْ أَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَٰنَهُمۡ أَرۡبَابٗا مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَٱلۡمَسِيحَ ٱبۡنَ مَرۡيَمَ وَمَآ أُمِرُوٓاْ إِلَّا لِيَعۡبُدُوٓاْ إِلَٰهٗا وَٰحِدٗاۖ لَّآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَۚ سُبۡحَٰنَهُۥ عَمَّا يُشۡرِكُونَ ۝٣١﴾

”ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا اور مریم کے

---

[1] الشوریٰ 21:42

بیٹے مسیح کو بھی، حالانکہ انھیں صرف اکیلے اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ان کے شریک مقرر کرنے سے وہ پاک ہے۔"[1]

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ[2] نے جب یہ آیت مبارکہ سنی تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اہل کتاب نے تو اپنے احبار ورہبان کی کبھی عبادت نہیں کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا: "ہاں، عبادت تو نہیں کی، لیکن جب ان علماء اور درویشوں نے حرام کو حلال بنا دیا تو عوام نے اس میں ان کی اطاعت کی اور جب انھوں نے حلال کو حرام قرار دے دیا تو عوام نے اسے بھی منظور کر لیا۔"[3]

پس جو شخص دین الٰہی میں کسی کی دخل اندازی منظور کر لیتا ہے گویا وہ اس کی تحلیل و تحریم اور استحباب و ایجاب کو قبول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ بھی اس مذمت کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے، ہاں کبھی یوں ہوتا ہے کہ یہ تحلیل و تحریم اجتہاد کی بنا پر ہوتی ہے تو اسے ان کے اجتہاد کی وجہ سے معاف کر دیا جاتا ہے بشرطیکہ یہ اجتہاد ایسا ہو کہ غلطی ہو جانے کی بنا پر قابل معافی ہو بلکہ اس اجتہاد پر ثواب بھی ملتا ہے۔ اس صورت میں مذمت لاحق نہیں ہوتی کیونکہ اس کی شرط مفقود ہوتی ہے یا کوئی اور مانع موجود ہوتا ہے، اگرچہ مقتضی قائم ہوتا ہے۔ البتہ اس شخص کو مذمت ضرور لاحق ہوتی ہے جو حق جان لینے پر بھی اس کام کو نہیں چھوڑتا یا حق کی جستجو میں کوتاہی کرتا ہے یا کسی خود غرضی یا سستی کی بنا پر سرے سے حق کی تلاش ہی نہیں کرتا۔

---

① التوبة 31:9

② یہ عیسائی تھے پھر ایمان لے آئے۔

③ جامع الترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة التوبه، حدیث:3095۔ اس کی سند میں غطیف بن اعین ضعیف ہے۔

مشرکوں کی مذمت کیوں کی گئی؟

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کی دو باتوں پر مذمت کی ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے کسی دلیل کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ کے شریک قرار دے لیے ہیں، دوسری یہ کہ ایسی چیزوں کو حرام ٹھہرالیا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیں۔ نبی کریم ﷺ نے اسے بہت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی حدیث ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے اپنے تمام بندوں کو توحید پر پیدا کیا تھا لیکن شیطان نے انھیں گمراہ کر دیا۔ جو چیزیں میں نے حلال قرار دی تھیں وہ انھوں نے حرام کر دیں اور لوگوں کو حکم دیا کہ بے دلیل میرے شریک بنا لیں۔''[1]

قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے:

﴿ سَيَقُولُ ٱلَّذِينَ أَشْرَكُوا۟ لَوْ شَآءَ ٱللَّهُ مَآ أَشْرَكْنَا وَلَآ ءَابَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَىْءٍ ﴾

''اب مشرک کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہی ہم کوئی چیز حرام قرار دیتے۔''[2]

اسی طرح مشرکین میں دو عیب، یعنی شرک اور تحریم ایک ساتھ موجود تھے۔ شرک کے مفہوم میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ مشرکین کا بھی یہی خیال تھا کہ بتوں کی عبادت واجب ہے یا مستحب اور یہ کہ ان بتوں کی پوجا کرتے رہنا، اسے چھوڑ

---

① صحيح مسلم، الجنة وَنَعِيمهَا، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار، حديث:2865

② الأنعام 148:6

دینے سے بہتر ہے۔ پھر ان مشرکین میں سے اکثر نے غیر اللہ کی اس لیے پرستش کی تھی کہ اس کے ذریعے سے تقرب الٰہی حاصل کیا جائے۔ اور یوں ایک نیا دین بنالیا تھا اور اپنے زعم میں اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے تھے۔ جیسا کہ عیسائیوں نے طرح طرح کی عبادتیں اور ریاضتیں ایجاد کر رکھی تھیں۔

گمراہی کی بنیاد

انسان کی گمراہی کی بنیاد دو باتوں پر ہے، ایک یہ کہ ایسا دین اختیار کرنا جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر نہیں کیا اور دوسری یہ کہ ایسی چیزیں حرام قرار دینا جنھیں اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا۔ اسی لیے امام احمد وغیرہ جیسے ائمہ کرام رحمہم اللہ نے اپنے مذاہب کی اصل یہ قرار دی ہے کہ مخلوق کے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں:

① عبادات، جنھیں دین قرار دیا جاتا ہے اور ان سے آخرت میں یا دنیا و عقبیٰ دونوں میں نفع کی امید کی جاتی ہے۔

② عادات، جن سے دنیاوی زندگی میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ عبادات میں اصل یہ ہے کہ صرف وہی عبادت اختیار کی جائے جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ اور عادات میں اصل یہ ہے کہ صرف اسی عادت سے منع کیا جائے، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔[1]

---

[1] یہ ایک جامع اور مفید قاعدہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان فرمادیا ہے۔ پہلی اصل (وہی عبادت قابل قبول ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے) نہایت معقول ہے کیونکہ عبادت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو لیکن چونکہ اللہ کی خوشنودی اس وقت تک معلوم نہیں کی جاسکتی جب تک خود اللہ کی طرف سے اس کا بیان نہ ہو، اس لیے کوئی عبادت حکم الٰہی کے بغیر نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ جسے ہم اپنی طرف سے عبادت کہیں وہ اللہ کو ناپسند ہو۔ اور کاش دوسری اصل پر ہمارے نام نہاد علمائے دین غور کریں جن کے ہاں محرمات کی فہرست طیبات سے زیادہ ہوگئی ہے۔

اس اصل اور قانون کی بنا پر ان ایجاد کردہ عیدوں، تہواروں اور میلوں سے صرف اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ انھوں نے نئے دین کی صورت اختیار کرلی ہے، جس کا مقصود قرب الٰہی ہوتا ہے۔

بدعت

بدعت ہمیشہ مکروہ ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک عام قاعدہ اور اصول ہے لیکن بعض لوگوں نے بدعت کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، حسنہ اور سیئہ۔ اور بطورِ دلیل، نماز تراویح کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول پیش کرتے ہیں کہ "نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ"[1] (یہ کس قدر اچھی بدعت ہے۔) نیز ایسے اقوال و افعال پیش کرتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عمل میں آئے، مگر مکروہ نہیں سمجھے گئے، بلکہ اجماع یا قیاس کی رو سے مستحسن قرار دیے گئے ہیں۔

بعض ناقص علم والے اسی سلسلے میں لوگوں کی بہت سی عادتیں بھی داخل کر دیتے ہیں اور ان سے استدلال کرتے ہیں کہ بعض بدعتیں حسنہ بھی ہوتی ہیں اس لیے کہ وہ یا تو اپنی عادت اور اپنی جان پہچان والے لوگوں کی عادت کو اجماع قرار دے دیتے ہیں خواہ انھیں باقی تمام مسلمانوں کے فیصلے کا علم نہ بھی ہو، اور یا اس لیے کہ اپنی عادت کی وجہ سے اس کام کا چھوڑنا منکر سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بعض لوگوں کی نسبت فرمایا گیا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ﴾

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام اور رسول کی طرف رجوع

---

[1] صحيح البخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، حديث:2010 وموطأ الإمام مالك، رمضان: 3

کرو تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے۔"[1]

یہ غلطی ان لوگوں میں بہت عام ہے جو علم یا عبادت کی طرف منسوب ہونے میں ممتاز ہیں۔ یہ لوگ ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جو دین میں معتبر اور قابل اعتماد علمی اصولوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ بدعت کی مذمت میں ثابت شدہ صریح نصوص ان دلائل کے مخالف پڑتی ہیں جو بعض بدعتوں کے حسنہ ہونے کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان دلائل کو یا تو شریعت کے صحیح دلائل سے اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یا یہ ایسے لوگوں کی حجتیں ہیں جن پر جاہل اور تاویل کرنے والے لوگ ہی بھروسا کرتے ہیں۔

یہ مخالف دو توجیہیں بیان کرتے ہیں، ایک یہ کہ جب بعض بدعتوں کا حسنہ ہونا اور بعض کا سیئہ ہونا ثابت ہوگیا، تو سیئہ وہی ہے جس سے شارع نے منع کر دیا ہے اور جن بدعتوں پر شارع نے سکوت اختیار کیا ہے وہ سیئہ اور قبیح نہیں ہیں بلکہ حسنہ ہوسکتی ہیں۔ اور دوسری یہ کہ وہ بدعت سیئہ ہی کو بدعت حسنہ کہیں، اس لیے کہ اس میں فلاں فلاں مصلحتیں ہیں۔ غرض ان لوگوں کا اصول یہ ہے کہ ہر بدعت گمراہی نہیں ہے۔

پہلی توجیہ کا جواب

ہمارا جواب یہ ہے کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہو چکا ہے کہ "بدترین کام بدعت کے کام ہیں" اور یہ کہ "ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں (لے جاتی) ہے۔"[2] رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بدعت کے بارے میں یہ نصِ صریح موجود ہے، لہٰذا کسی کے لیے جائز نہیں کہ اسے رد کر دے، جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ بلاشبہ ناجائز جدال کا مرتکب ہوتا ہے۔

---

[1] المائدۃ 5:104

[2] صحیح مسلم، الجمعۃ، باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ، حدیث:867 وسنن النسائی، صلاۃ العیدین، باب کیف الخطبۃ، حدیث: 1579

مخالفین کے دلائل کا جواب دو اور طریقوں سے بھی ہوسکتا ہے کہ جس چیز کا استحسان اور خوبی شریعت سے ثابت ہو جائے وہ سرے سے بدعت ہی نہیں ہے اور جو بدعت ہے وہ حسنہ نہیں۔ اس صورت میں بھی یہ حکم اپنی عمومی حالت پر باقی رہے گا کہ ہر بدعت گمراہی اور سیئہ ہے اور اس میں کوئی خصوص پیدا نہیں کیا جائے گا۔ یا یہ بات کہی جائے کہ جس بات میں استحسان ثابت ہو جائے وہ اس عموم میں خصوص کا حکم رکھے گی۔ اور یہ معلوم ہے کہ عام مخصوص اپنے خصوص کے سوا ہر وقت دلیل ہے۔ پس جس کسی کا اعتقاد یہ ہے کہ بعض بدعتیں اس حکم عام میں خصوص کا درجہ رکھتی ہیں تو اسے ان بدعتوں کی تخصیص پر قوی دلیل پیش کرنا ہوگی ورنہ یہ حکم عام، لفظی و معنوی طور پر ممانعت کا موجب بنا رہے گا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تخصیص پیدا کرنے والے دلائل صرف شرعی دلائل ہوسکتے ہیں، یعنی کتاب وسنت اور اجماع کے دلائل، خواہ ان کا تعلق نص سے ہو یا استنباط سے۔ بعض ملکوں کا یا اکثر ملکوں کا عمل و عادت، بعض علماء و عُبّاد کے اقوال یا اکثر علماء و عُبّاد کے اقوال یا اسی طرح کی دوسری حجتیں کسی حال میں بھی رسول اللہ ﷺ کے کلام کی معارض نہیں ہوسکتیں۔

اجماع کا دعویٰ

اور جو شخص سمجھتا ہے کہ یہ مخالفِ سنت عادتیں اجماعِ امت کی سند حاصل کر چکی ہیں، کیونکہ امت نے ان کو جاری رہنے دیا اور ان کی مخالفت نہیں کی، تو اس کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ ہر زمانے میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو ان مخالفِ سنت عادات کی مخالفت و ممانعت کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے کسی ایک مقام یا بہت سے مقامات کا عمل، اجماع کے دعوے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے چند جماعتوں کا عمل بدرجہ اولیٰ اس کی دلیل نہیں ہوگا۔

جب اکثر اہلِ علم نے امام مالک رحمہ اللہ کے زمانے میں موجود علمائے مدینہ کا عمل اور اجماع قابلِ حجت قرار نہیں دیا بلکہ سنت کو ان لوگوں پر بھی حجت سمجھا جیسا کہ وہ دوسروں پر حجت ہے، حالانکہ ان کا علم وایمان مشہور ومعروف ہے، تو پھر مومن عالم ان لوگوں کے اعمال کو کیونکر حجت سمجھ سکتا ہے جنھوں نے محض عادت یا تقلید کی راہ سے انھیں اختیار کر لیا ہے، یا عوام نے انھیں ان پر مجبور کر دیا ہے، یا ایسے لوگوں نے مجبور کر دیا ہے جو جہالت کی راہ سے سرداری کے رتبے پر پہنچے ہیں۔ وہ علم میں رسوخ رکھتے ہیں نہ اولوا الامر میں شمار کیے جاتے ہیں اور نہ شوریٰ (مشورہ) کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ شاید اللہ اور اس کے رسول پر پورا ایمان بھی نہیں رکھتے یا ایسے لوگوں کا عمل جو اگرچہ اہلِ فضل ہیں، مگر بغیر سوچے سمجھے محض عادت کی وجہ سے اس بھیڑ میں چلے گئے ہیں یا کسی شبہ نے انھیں ان اعمال میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان لوگوں کی نسبت زیادہ سے زیادہ اچھا گمان یہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ائمہ وصدیقین کی جماعت مجتہدین کے درجے میں ہیں۔ لیکن اس کا جواب معلوم ہی ہے کہ ان لوگوں کے اعمال، یا دوسرے لوگوں کے اعمال شریعت میں حجت نہیں بن سکتے۔ ان سے استدلال کرنا اہلِ علم کا طریقہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہالت عام ہوگئی ہے اکثر لوگ ایسے واہی اور کمزور دلائل کو مستند سمجھنے لگے ہیں حتی کہ علمِ دین سے نسبت رکھنے والوں میں سے بھی بعض اس جہالت کا شکار ہو گئے ہیں۔

بعض اوقات، بعض اہلِ علم کچھ اور دلیلیں بھی پیش کرتے ہیں مگر اللہ جانتا ہے کہ ان کا قول وعمل، شریعت میں دلیل وحجت نہیں اور اگر انھیں شبہ واقع ہوتا ہے تو وہ بھی ایسے امور پر مبنی ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ماخوذ نہیں ہیں اور جن پر اہلِ علم وایمان یقین نہیں رکھتے بلکہ دوسرے لوگ ہی بھروسا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ شرعی حجتیں صرف اس لیے بیان کرتے ہیں کہ مخاطب کو خاموش کرا سکیں، حالانکہ یہ قابلِ تعریف مناظرہ نہیں، تعریف کے

لائق مناظرہ کی اوّلین شرط یہ ہے کہ ایسی دلیلیں اور حجتیں بیان کی جائیں جو اقوال واعمال میں مستند ہوں، ورنہ واہی اصول بیان کرنا اور کھینچ تان کر ثابت کرنا، علم ومناظرہ اور کلام وعمل کے باب میں ایک قسم کا نفاق ہے۔

پھر یہ بھی درست نہیں کہ حدیث [كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ] [1] ''ہر بدعت گمراہی ہے'' سے خاص طور پر صرف وہی بدعتیں مراد لی جائیں جن کی ممانعت ثابت ہے کیونکہ ایسا کرنے سے یہ حدیث معطل ہوجائے گی۔ کفر وفسق اور جملہ معاصی جن سے شارع نے صراحتاً منع کردیا ہے، ان کی قباحت وحرمت تو اس ممانعت ہی سے معلوم ہوجاتی ہے۔ اس حدیث سے ان کا کوئی تعلق نہیں، لیکن اگر تسلیم کرلیا جائے کہ دین میں منکر وہی ہے جس سے خاص طور پر منع کردیا گیا ہے خواہ عہد نبوی میں اس پر عمل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اور یہ کہ جس بات سے منع کردیا گیا ہے وہی منکر ہے، خواہ وہ بدعت ہو یا نہ ہو، تو اس صورت میں بدعت کی تعریف بے اثر ہوجائے گی، اس کا وجود برائی پر دلالت کرے گا نہ اس کا عدم اچھائی پر دلالت کرے گا۔ بلکہ فرمان نبوی [كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ] کے معنی یہ ہوجائیں گے کہ عرب وعجم کی ہر عادت گمراہی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا تحریف والحاد کی راہ سے نصوص کی تعطیل ہے نہ کہ جائز تاویل۔ اور اس میں متعدد مفاسد ہیں۔ ان میں سے بعض کی تشریح حسب ذیل ہے:

① یہ حدیث بے معنی ہوجاتی ہے کیونکہ جس خاص بات کی نسبت آپ کی ممانعت موجود ہے اس کا حکم اس ممانعت سے ثابت ہے اور جس بات کی ممانعت موجود نہیں وہ اس حدیث کے ذیل میں داخل نہیں ہوسکتی۔ اس طرح یہ حدیث لغو قرار پاتی ہے۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے خطبوں میں یہ حدیث بیان فرمایا کرتے تھے اور اسے جوامع الکلم میں شمار کرتے تھے۔

---

[1] صحيح مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة، حديث: 867(43)

② لفظ بدعت کا معنی ومفہوم بے اثر ہوجائے گا، کسی چیز پر بھی اس لفظ اور اس کے معنی کا اطلاق نہ ہوسکے گا۔

③ بدعت ایک عام لفظ ہے اور ممانعت اس میں تخصیص پیدا کرتی ہے، یعنی دونوں میں عموم وخصوص کی نسبت ہے۔ ایسی صورت میں عموم بول کر خصوص مراد لینا، مگر خصوص کو بیان نہ کرنا، واجب البیان امر کو چھپانا اور مبہم معنی ظاہر کرنا ہے۔ حالانکہ یہ صریح تدلیس ہے جو ایک مدلس ہی سے واقع ہوسکتی ہے، نہ کہ رسول اللہ ﷺ سے۔

④ اگر ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ'' اور ''إِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ''① سے آپ کی مراد وہی باتیں ہیں جن کی بابت خاص طور پر نہی وارد ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے مسلمانوں کو اس حدیث سے ایک ایسا مطلب سمجھنے کے لیے چھوڑ دیا جسے وہ مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے اور اس کے اکثر حصے کو بھی خاص اشخاص کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا حالانکہ ایسا کرنا بھی جائز نہیں۔

⑤ اگر اس حدیث سے مراد وہی باتیں ہیں جن کی بابت خاص طور سے نہی وارد ہے تو ان باتوں کی تعداد ان باتوں سے بہت کم ہے جن کی نسبت کوئی نہی وارد نہیں اور ظاہر ہے عام بول کر قلیل یا نادر صورتیں مراد لینا روا نہیں۔

ان کے ساتھ ساتھ کئی دوسری وجوہ کی موجودگی میں قطعی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ مخالفین کی تاویل فاسد ہے اور اس حدیث پر منطبق نہیں کی جاسکتی، خواہ وہ اپنی تاویل کو کسی دلیل صارف سے قوی کریں یا نہ کریں، بہر حال یہ تاویل کرنے والے کے ذمے ہے کہ اس معنی کو شارع کا مقصود ہونا ثابت کرے جس پر اس نے حدیث کو محمول کیا ہے۔ پھر اپنی وہ دلیل بیان

---

① سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث:4607 و جامع الترمذي، العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدعة، حديث:2676۔ اس کی سند صحیح ہے۔

کرے جس کی بنا پر اسے اس خاص معنی پر محمول کرتا ہے، حالانکہ مذکورہ بالا وجوہات یہ معنی مراد لینے سے مانع ہیں۔ ان کی پہلی توجیہ کا جواب مکمل ہو چکا ہے۔

دوسری توجیہ کا جواب

رہ گئی ان کی دوسری توجیہ تو اس بارے میں عرض ہے کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ بدعات دو قسم کی ہیں، یعنی حسنہ اور سیئہ، اور یہ فرض کر لینا اس بات سے مانع نہیں ہے کہ حدیث تمام بدعتوں کی مذمت پر دلالت کرے۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی بدعت کا استحسان ثابت ہو جائے تو وہ اس عموم سے مستثنیٰ ہو جائے گی اور یہ حدیث اپنی اصل جگہ قائم رہے گی کہ ہر بدعت گمراہی ہے، کیونکہ ہم پہلے تمام معارضات کے جواب میں کہہ چکے ہیں کہ جو بدعت حسنہ ثابت ہو جائے وہ یا تو سرے سے بدعت ہی نہیں یا عموم میں خصوص کا حکم رکھتی ہے۔ اس طرح حدیث کی دلالت اپنی جگہ محفوظ رہتی ہے۔

یہ اس صورت میں جواب ہے جب کسی بدعت کا استحسان ثابت ہو جائے البتہ وہ معاملات جنھیں مستحسن سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ مستحسن نہیں ہیں۔ اور وہ امور جو حسنہ بھی ہو سکتے ہیں اور سیئہ بھی، تو ان سے استدلال کرنا درست نہیں۔ ان سب کی بابت ہم یہی مرکب جواب پیش کریں گے کہ اگر ان میں سے کسی چیز کا استحسان ثابت ہو جائے تو وہ بدعت ہی نہ ہو گی یا اس عموم میں خصوص کا حکم رکھے گی اور اگر اس کا استحسان ثابت نہ ہو تو وہ بدستور حکمِ عام میں داخل رہے گی۔

دونوں جوابوں کی صورت میں حدیث کی دلالت اور حکم اپنی جگہ برقرار رہتا ہے اور مخالفین کے دلائل سے مسترد نہیں ہوتا۔

پھر یہ کسی کے لیے روا نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اس جامع وکلی کلام ''كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ''

کو مسترد کر دے اور اس کے مفہوم کا بالکل انکار کر دے اور کہنے لگے کہ ہر بدعت گمراہی نہیں ہے، کیونکہ یہ بات تاویل کی حیثیت رکھنے سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے سرکشی کی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ جب کسی فعل کا استحسان ثابت ہو جائے تو کہنا چاہیے کہ وہ خاص فعل بدعت ہی نہیں ہے، اس لیے حدیث کے حکم میں داخل نہیں، یا یہ کہ وہ فعل اس عموم سے فلاں فلاں دلیل کی رو سے مستثنیٰ ہے لیکن پہلا جواب بہتر ہے اور دوسرا جواب محلِ نظر ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے عموم کا قصد صاف ظاہر ہے اور کسی حال میں بھی مناسب نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصود سے روگردانی کی جائے۔

نمازِ تراویح

رہ گئی نمازِ تراویح تو وہ بدعت نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل دونوں سے اس کا سنت ہونا ثابت ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کیے ہیں اور میں نے اس میں قیام (نماز) کو سنت بنایا ہے۔''[1] کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے اوائل رمضان میں دو بلکہ تین راتیں باجماعت تراویح کی نماز پڑھی تھی۔ نیز رمضان کے آخری عشرے[2] میں کئی بار پڑھی تھی اور فرمایا تھا: ''آدمی جب امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور امام کے رخصت ہونے تک ٹھہرا رہتا ہے تو اسے پوری رات کے قیام کا ثواب ملتا ہے۔''[3] یہ اس

---

① سنن النسائی، الصیام، باب ذكر اختلاف يحيى بن أبي كثير ...... الخ، حدیث: 2212 و سنن ابن ماجه، إقامة الصلوٰت، باب ماجاء في قيام شهر رمضان، حدیث: 1328 و مسند أحمد: 195,191/1۔ اس کی سند میں نضر بن شیبان ضعیف ہے۔

② صحيح البخاري، صلاة التراويح، باب فضل من قام رمضان، حديث: 2012 و صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب في قيام رمضان، حديث :761

③ سنن أبي داود، شهر رمضان، باب في قيام شهر رمضان ، حديث: 1375 و جامع الترمذي، الصوم، باب ماجاء في قيام شهر رمضان، حديث: 806۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

وقت فرمایا تھا جب کہ آپ نے ان کے ساتھ لمبا قیام کیا حتیٰ کہ سحری کے رہ جانے کا خدشہ لاحق ہو گیا۔

اصحابِ سنن نے یہ حدیث روایت کی ہے اور ائمہ کرام میں سے امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ تراویح کی نماز تنہا پڑھنے سے جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے۔ظاہر ہے اس حدیث میں امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس طرح وہ سنت مطلقہ نہیں، مؤکدہ ثابت ہوتی ہے۔ پھر صحابہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھتے تھے اور آپ ان پر اعتراض نہ کرتے تھے۔آپ کا معترض نہ ہونا اور اسے جاری رہنے دینا، خود سنت ہونے کا ثبوت ہے۔

رہ گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کے بارے میں یہ کہنا کہ ''یہ بہت اچھی بدعت ہے'' تو ان کے اس قول سے مخالفوں کے لیے حجت پکڑنا درست نہیں۔ کیونکہ دوسرے موقعوں پر اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کسی ایسے قول سے کوئی حکم ثابت کیا جائے جس پر کسی نے ان کی مخالفت نہ کی ہو تو یہی مخالف کہہ دیتے ہیں کہ صحابی کا قول حجت نہیں۔اگر ان کا یہ قانون صحیح ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ان لوگوں کے لیے کیونکر حجت ہوسکتا ہے؟ پھر جو لوگ صحابی کے قول کو حجت مانتے ہیں، وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے قولِ صحابی سے حجت نہیں لائی جاسکتی جو حدیث کے خلاف ہو۔ بہر حال دونوں قسم کے لوگ جو صحابی کا قول حجت مانتے ہیں اور جو نہیں مانتے، ان سب کے نزدیک صحابی کے قول کو حدیث کے مدمقابل کھڑا کرنا روا نہیں۔ بلاشبہ صحابی کا وہ قول جس پر کسی نے اعتراض نہ کیا ہو، اس سے حدیث کے عموم کی تخصیص (ایک روایت کی رو سے) جائز ہے۔ اس اصل اور ضابطے کی بنا پر صرف اس قدر ثابت ہوسکتا ہے کہ کسی ایک خاص بدعت کا استحسان ثابت ہو جائے لیکن باقی بدعات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

پھر ہم کہتے ہیں کہ اس روایت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نمازِ تراویح کو "بدعت حسنہ" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے لیکن یاد رکھیے یہ تعبیر لغوی ہے نہ کہ شرعی، اور معلوم ہے کہ لغت میں بدعت کا اطلاق تمام ایسے افعال پر ہوتا ہے جو ابتدا اور شروع میں کیے جائیں اور جن کی کوئی سابق مثال موجود نہ ہو، لیکن شریعت کی اصطلاح میں بدعت وہ فعل ہے جس کے جواز پر کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی فعل کے استحباب یا ایجاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کوئی نص آپ کی وفات کے بعد دلالت کرے تو اس پر عمل کیا جائے گا۔ جیسا کہ وہ کتاب الصدقہ (جس میں زکاۃ کے تفصیلی احکام تھے) جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جاری کیا تھا[1] تو ایسے فعل کو لغت کے اعتبار سے بدعت کہنا صحیح ہوگا کیونکہ اس کی کوئی سابق مثال موجود نہیں، حتیٰ کہ خود اسلام کو لغت کے لحاظ سے بدعت ومحدث کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ قریش کے سفیروں نے نجاشی کے دربار میں مہاجرین کی مخالفت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "یہ لوگ اپنے بزرگوں کے دین سے برگشتہ ہو گئے ہیں خود بادشاہ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہیں، بلکہ ایک محدث (یعنی نوایجاد) دین کو مانتے ہیں جسے کوئی نہیں جانتا۔"[2]

جس فعل پر کتاب وسنت دلالت کریں وہ لغت کے اعتبار سے اگرچہ بدعت شمار ہوسکتا ہے، لیکن شرعی لحاظ سے وہ بدعت نہیں قرار پاسکتا، یہ اس لیے کہ لغت میں لفظ بدعت کے معنی شریعت میں اس کے معنی سے زیادہ عام ہیں۔ ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ"[3] سے ہر اس فعل کی مذمت مقصود نہیں ہے جو پہلے پہل کیا جائے، کیونکہ خود اسلام اور انبیاء علیہم السلام کے لائے ہوئے تمام دین اپنی جگہ پر نئے اور بغیر کسی سابق مثال کے تھے (چنانچہ

---

① صحیح البخاری، الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم، حدیث:1454

② دیکھیے سیرت ابن ھشام:1/372

③ صحیح مسلم، الجمعۃ، باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ، حدیث:867 وسنن النسائی، صلاۃ العیدین، باب کیف الخطبۃ، حدیث:1579

اگر آپ کے فرمان سے لغوی بدعت مقصود ہو پھر تو تمام ادیان اور اسلام بھی بدعت ہوگا، اس لیے اس قول سے لغوی بدعت مراد نہیں) بلکہ اس حدیث سے مقصود (شرعی بدعت اور) وہ اعمال ہیں، جنھیں شارع علیہ السلام نے مشروع قرار نہیں دیا۔

نمازِ تراویح کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے زمانے میں اسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم باجماعت بھی ادا کرتے تھے اور علیحدہ علیحدہ بھی پڑھتے تھے۔ آپ نے ان سے تیسری یا چوتھی رات میں جب وہ جمع تھے، فرمایا:

''میں صرف اس خیال سے نماز کے لیے باہر نہیں نکلا کہ کہیں وہ تم پر فرض نہ ہو جائے۔[1] اور فرمایا: اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو کیونکہ فرض کے علاوہ سب سے افضل نماز وہی ہے جو گھر میں پڑھی جائے۔''[2]

غور کریں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے باہر نہ آنے کی وجہ یہ قرار دی کہ مبادا یہ نماز فرض ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ باہر آنے کا مقتضی اور مقصد ''یعنی نماز'' اپنی جگہ پر بدستور موجود اور قائم ہے اور اگر فرض ہو جانے کا خوف نہ ہوتا تو آپ ضرور تشریف لاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں لوگوں کو باجماعت تراویح پڑھنے کے لیے جمع کیا اور مسجد میں روشنی کا اہتمام کیا۔ نماز کی یہ خاص ہیئت یعنی مسجد میں ایک امام کے پیچھے کھڑا ہونا اور روشنی کرنا ایک ایسا فعل تھا، جسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پہلے نہیں کیا کرتے تھے، لہٰذا اسے بدعت کہا گیا کیونکہ لغت میں اس کا یہی نام ہوسکتا ہے، اگرچہ شریعت میں وہ بدعت نہیں ہے۔ اور شریعت میں یہ نماز کیونکر بدعت ہوسکتی ہے جبکہ سنت سے اس کا عمل صالح ہونا ثابت ہے۔ اسے تو

---

[1] صحیح البخاری، التهجد، باب تحريض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی قيام الليل ...... الخ، حدیث: 1129و صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب الترغيب فی قيام رمضان وهو التراويح، حدیث:761

[2] صحیح البخاری، الأذان، باب صلاة الليل، حدیث: 731و صحيح مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة فی بيته ...... الخ، حدیث:781

صرف فرض ہو جانے کے خوف سے جاری نہیں رکھا گیا تھا، لیکن جب آپ ﷺ کی وفات کے بعد یہ خوف جاتا رہا تو اب اس کے عمل سے روکنے والا کوئی مانع بھی باقی نہیں رہا، لہٰذا اسے شروع کر دیا گیا۔

وہ بدعات جو دراصل بدعات نہیں

اس طرح کی بہت سی مثالیں موجود ہیں مثلاً قرآن مجید کا جمع کرنا، عہد نبوی میں قرآن مجید جمع نہیں کیا گیا، کیونکہ وحی کا سلسلہ جاری تھا اور احکام میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبدیلی ہوتی رہتی تھی اگر کتاب کی شکل میں جمع کر دیا جاتا تو ہر وقت تبدیلی کرنے کی وجہ سے مشکل پیش آتی لیکن جب آپ ﷺ کی وفات کے ساتھ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور شریعت ایک نہج پر قائم ہو گئی تو قرآن کو جمع کر لیا گیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ فعل لغت کے اعتبار سے بدعت تھا، مگر شرعی لحاظ سے نہیں کیونکہ ان کا یہ فعل سنت نبوی کے عین مطابق تھا۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیبر کے یہودیوں اور نجران کے عیسائیوں کو عرب سے جلاوطن کر دینے کا معاملہ ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے مرض الموت میں اس کی وصیت کی تھی۔[1] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مرتدین اور فارس وروم کی جنگوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دے سکے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب مہلت ملی تو انھوں نے نبوی وصیت پوری کر دی۔ ان کے اس فعل کو لغت میں بدعت کہا جائے گا۔ چنانچہ خود یہودیوں نے

---

[1] صحيح البخاري، الجزية والموادعة، باب إخراج اليهود من جزيرة العرب، حديث: 3168 وصحيح مسلم، الوصية، باب ترك الوصية لمن ليس له شيء يوصى فيه، حديث: 1637۔ ان روایتوں میں یہود ونصاریٰ کے بجائے مشرکین کا لفظ ہے البتہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہود ونصاریٰ کے الفاظ بھی موجود ہیں دیکھیے: صحيح مسلم، الجهاد، باب إخراج اليهود والنصارىٰ من جزيرة العرب، حديث: 1767۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس جانب متوجہ کیا تھا، کہنے لگے: ''آپ ہمیں نکالے دیتے ہیں حالانکہ ابوالقاسم یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں رہنے دیا تھا۔''[1] نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں وہ پھر فریادی ہوئے اور واپس آنے کی اجازت چاہی۔ کہنے لگے: ''ہمارے پاس جو تحریر موجود ہے وہ خود آپ ہی کے ہاتھ سے لکھی ہوئی ہے'' لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی درخواست منظور نہ کی، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد واقع ہوا اور خود آپ کے عمل کو بدل ڈالنے والا تھا لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کے مطابق تھا اس لیے شرعاً بدعت قرار نہیں پایا۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا زکاۃ نہ ادا کرنے والوں سے جنگ کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بہت سے اور واقعات بھی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں مگر ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اصول

وہ کام جو عہد نبوی میں نہ تھے ان کو ایجاد کرنے کے متعلق یہ اصول اور ضابطہ بیان کیا جاسکتا ہے، کہ لوگ کوئی نئی بات اسی خیال سے ایجاد کرتے ہیں کہ وہ ان کو مفید محسوس ہوتی ہے اور ان کو اس میں کوئی مصلحت نظر آتی ہے کیونکہ اگر اسے نقصان دہ اور خلاف مصلحت سمجھیں تو اسے اختیار ہی کیوں کریں؟

اس قاعدے کی بنا پر دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا سبب ہے جو مسلمانوں کو کسی بات کے مفید سمجھنے پر آمادہ کرتا ہے؟ اگر یہ سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیش آیا اور آپ نے اس کی بابت کوئی ممانعت نہیں فرمائی تو اس کا اختیار کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر کسی بات کی ضرورت

---

[1] صحیح البخاری، الشروط، باب إذا اشترط فی المزارعة ...... الخ، حدیث: 2730

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھی مگر اسے آپ نے کسی خاص مانع کی بنا پر چھوڑ دیا، جو آپ کی وفات سے دور ہو گیا تو اس فعل کا اختیار کرنا بھی جائز ہے لیکن اگر ضروری سبب اور وجہ نہ ہو، یا وہ سبب خود لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو تو اس کا اختیار کرنا کسی صورت میں جائز نہیں۔

پھر اگر کسی فعل کی ضرورت رسول اللہ ﷺ کے عہد میں موجود تھی اس ضرورت کے باوجود اسے آپ نے ترک کر دیا، تو سمجھ لینا چاہیے کہ آپ نے اس کی ضرورت تسلیم نہیں کی لہٰذا وہ سرے سے مصلحت ہی نہیں ہے۔ البتہ جس فعل کی ضرورت آپ کے بعد پیدا ہوئی اور اس کی علت وسبب، مخلوق کی معصیت نہ ہو تو وہ فعل مفید ہو سکتا ہے اور اس میں مصلحت کا امکان موجود ہے۔

فقہاء کے دو مسلک

اس بارے میں فقہا کے دو مسلک ہیں، ایک یہ کہ جس بات کی مخالفت وارد نہیں وہ جائز ہے، یہ ان لوگوں کا مسلک ہے جو مصالح مرسلہ کے قائل ہیں۔ دوسرا مسلک یہ ہے کہ وہی عمل کرنا چاہیے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو مصالح مرسلہ کی بنا پر احکام کا ثبوت تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اس آخر الذکر فریق میں مزید دو گروہ ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ وہی بات ثابت ہے جو شارع کے قول، فعل یا اقرار سے صراحتاً منقول ہو۔ یہ لوگ قیاس کے منکر ہیں۔ دوسرا گروہ احکام کو شارع علیہ السلام کے الفاظ اور ان کے مفہوم سے بھی ثابت کرتا ہے۔ یہ لوگ قیاس کے قائل ہیں۔

علمائے سوء اور گمراہ صوفی

بہر حال جس فعل کی ضرورت عہد نبوی میں موجود تھی، مگر آپ نے اسے مشروع قرار نہیں

دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس کی مصلحت تسلیم نہیں کی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے فعل کو جائز قرار دینا دین الٰہی میں تبدیلی کرنا ہے۔ اس قسم کی جرأت گمراہ بادشاہوں اور بے باک عالموں اور عابدوں ہی سے سرزد ہوئی ہے جن کو اپنے اجتہاد میں ٹھوکر لگی ہے اور وہ لغزش کا شکار ہو گئے ہیں۔ نبیٔ اکرم ﷺ سے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے کہ ''میں تم سب سے زیادہ جس چیز سے ڈرتا ہوں ان میں سے ایک عالم کی ٹھوکر اور لغزش ہے، اور دوسرے نمبر پر منافق کا قرآن کو لے کر جھگڑا اور مجادلہ کرنا ہے، اور تیسری خطرے والی چیز گمراہ پیشوا ہیں۔''[1]

مُسکِت استدلال

اس سلسلے کی ایک مثال عیدین میں اذان کا معاملہ ہے۔ بعض حکام نے اسے ایجاد کیا تو اس عہد کے مسلمانوں نے ان پر اعتراض بھی کیا اور ان کے اعتراض کی بنیاد یہی تھی کہ وہ بدعت ہے، ورنہ کہا جا سکتا تھا کہ اذان ذکرِ الٰہی ہے اور اس کے ساتھ مخلوق کو عبادتِ الٰہی کی طرف دعوت دی جاتی ہے، لہٰذا عیدین کی اذان ﴿اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا﴾ ''اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔''[2] اور ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِمَّنْ دَعَا إِلَى اللّٰهِ﴾ ''اس سے اچھی بات کہنے

---

[1] یہ روایت ان لفظوں کے ساتھ مرفوع ثابت نہیں ہو سکی البتہ بعض صحیح روایات میں اس کا ایک ایک ٹکڑا ثابت ہے مثلاً: گمراہ پیشواؤں کے متعلق مسند احمد میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی صحیح مرفوع حدیث موجود ہے دیکھیے: مسند أحمد: 441/6 و صحیح الجامع: (1551) 322/1 و السلسلة الصحيحة للألباني، حديث: 1582۔ اسی طرح ''منافق علیم اللسان ہے'' کے الفاظ بھی ثابت ہیں جن کو عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے مرفوع بیان کیا ہے دیکھیے: صحيح الجامع: (1554) 323/1 والسلسلة الصحيحة للألباني حدیث: 1127۔ البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول میں تینوں خطرات کا یکجا ذکر ثابت ہے، دیکھیے: سنن الدارمي، مقدمة، باب في كراهية أخذ الرأي، حديث: 220۔ اس کی سند حسن ہے۔

[2] الأحزاب 41:33

والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔''[1] کے عموم میں داخل ہے یا یہ کہ اسے جمعہ کی اذان پر قیاس کر لیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ عیدین میں اذان کے استحسان پر استدلال (کہ اس موقع پر اذان کہنا ایک حسن و خوبی والا اچھا کام ہے) اس استدلال سے کہیں زیادہ قوی ہے جو اکثر بدعتوں کی تائید میں کیا جاتا ہے لیکن اتنے قوی اور مضبوط استدلال کے باوجود بھی وہ بدعت ہی ہے کیونکہ عیدین میں اذان کی جو ضرورت بھی بتائی جائے وہ عہدِ نبوی میں بھی موجود تھی اور اس کے خلاف کوئی مانع بھی درپیش نہ تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے ترک کر دیا۔

جمعہ میں اذان کا حکم دیا لیکن عیدین کی نماز بغیر اذان واقامت کے پڑھی[2]۔ چونکہ آپ کا کسی فعل کو ترک کر دینا بھی اسی طرح سنت ہے جس طرح آپ کا کسی فعل کو اختیار کر لینا سنت ہے، اس لیے عیدین میں اذان کا ترک کرنا سنت شمار ہو گا اب کسی کے لیے روا اور جائز نہیں کہ اس طریقے میں کمی بیشی کرے۔

اس طریقے میں دست اندازی اور مداخلت ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز کی رکعتوں میں اضافہ کر دے۔ ظہر کی چار رکعتوں کے بجائے پانچ پڑھنے لگے اور دلیل یہ پیش کرے کہ نماز عمل صالح ہے اور چار کی جگہ پانچ رکعتیں عمل صالح میں اضافہ ہے، اس لیے مستحسن ومباح ہے۔ اس طرح پھر یہ بھی جائز ہوا کہ کوئی شخص کسی جگہ کو مخصوص کر کے دعا یا ذکرِ الٰہی کے لیے اس کا قصد کرے اور اس کی دلیل میں کہا جائے کہ ''یہ تو بدعت حسنہ ہے'' لیکن ہم اس فعل سے منع کریں گے اور کہیں گے کہ یہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔ اس خاص فعل کی

---

[1] فصّلت 33:41

[2] صحیح البخاری، العیدین، باب المشی والرکوب إلی العید.....الخ، حدیث: 959، 960 وصحیح مسلم، صلاۃ العیدین، باب: کتاب صلاۃ العیدین، حدیث: 887

بابت ہمیں معلوم ہے کہ یہ گمراہی ہے، قبل اس کے کہ اس کی متعلق نہی خاص ہم تک پہنچے۔ نیز اس کے ضرر اور نقصان سے بھی ہم واقف ہیں۔

یہ مثال ایسے اعمال کی ہے جو اگر خیر ہوتے تو ان کی ضرورت پہلے بھی موجود تھی اور کوئی مانع بھی درپیش نہ تھا مگر ان کی اجازت نہیں دی گئی، لہٰذا انھیں بدعت کے طور پر اختیار کرنے والے خواہ کتنی ہی حجتیں اور دلیلیں پیش کریں، مقبول نہیں ہوسکتیں کیونکہ ان کی یہ تمام نام نہاد مصلحتیں اور ضرورتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی موجود تھیں مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے انھیں اختیار نہیں کیا۔ آپ کا یہ ترک کرنا اور چھوڑنا ایک خاص سنت ہے اور ہر عموم قیاس پر مقدم ہے۔

بدعت کے کام

اب ایسے بدعیہ اعمال کی مثال پیش کی جاتی ہے جن کا سبب لوگوں کی اپنی غلطی اور کوتاہی ہے اور وہ عیدین کی نماز سے پہلے خطبہ دینا ہے۔ بعض حکام نے یہ بدعت ایجاد کی، مسلمانوں نے اعتراض کیا تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ لوگ خطبہ سننے سے پہلے ہی اٹھ جاتے ہیں جبکہ عہدِ نبوی میں وہ خطبے کا انتظار کرتے تھے۔[1]

ظاہر ہے اس بدعت کے جواز کے لیے یہ ضرورت صحیح قرار نہیں دی جاسکتی کیونکہ یہ ضرورت خود ان حکام کی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ نبیِ اکرم ﷺ اپنے خطبے میں مسلمانوں کی فلاح وہدایت کو مدنظر رکھتے تھے لیکن ان حکام کے پیش نظر اپنی سرداری اور وجاہت کے سوا کچھ نہ تھا۔

---

[1] اس قصے کے متعلق دیکھیے: صحیح البخاری، العیدین، باب الخروج إلی المصلّٰی بغیر منبر، حدیث: 956 و صحیح مسلم، صلاۃ العیدین، باب صلاۃ العیدین، حدیث: 889

لہٰذا حکام کی معصیت اور غلطی کسی دوسری معصیت کے جواز کا سبب تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ یہ بدعت جاری کرنے کے بجائے ان حکام کے لیے صحیح راستہ یہ تھا کہ توبہ کرتے اور سنتِ نبوی کی پیروی کرتے، پھر دیکھتے کہ لوگ ان کا خطبہ سنتے ہیں یا نہیں۔ اگر اس اصلاح کے باوجود نہ سنتے تو اللہ تعالیٰ ان حکام سے ان کے اعمال کا مؤاخذہ کرتا نہ کہ لوگوں کے اعمال کا۔

بدعت اور سنت

یہ دونوں ضابطے (کہ عہد نبوی میں ضرورت کے باوجود کام کا مشروع نہ ہونا اور لوگوں کی اپنی غلطی کا سبب بن جانا) جو شخص بھی ذہن نشین کرلے گا، وہ بدعتوں کے بارے میں بہت سے شبہات سے نجات پا جائے گا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا:

''جب لوگ کوئی بدعت جاری کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں سے اسی کے برابر کوئی ایک سنت نکال لیتا ہے۔''[1]

اس مطلب کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ درحقیقت سنن وشرائع دلوں کے لیے غذا ہیں۔ جب دل بدعتوں سے لبریز ہو جاتے ہیں تو ان میں سنتوں کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی برے کھانے سے پیٹ بھر لے تو پھر اچھا کھانا کیسے کھا سکتا ہے؟

اکثر بدعتیں خود لوگوں کی اپنی غلطیوں سے پیدا ہوگئی ہیں مثلاً حُکّام نے طرح طرح کی ظالمانہ روشیں اختیار کیں، ناجائز طور پر مال حاصل کیا، جرائم پر ناروا سزائیں مقرر کیں، کیوں؟

---

[1] مسند أحمد: 105/4۔ اس روایت کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف الجامع ص: 720 میں حدیث: 4983 کے تحت لکھا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ابوبکر بن عبداللہ ضعیف ہے، لہٰذا یہ روایت مرفوع ثابت نہیں البتہ حسان بن عطیہ رحمہ اللہ کا قول صحیح ثابت ہے دیکھیے: سنن الدارمی، المقدمہ، باب اتباع السنة، حدیث: 99۔

اس لیے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے شرعی طریقوں کے اجرا میں انھوں نے کوتاہی کی۔ اگر وہ حدودِ شرعیہ قائم کرتے، امیر وغریب اور قریب وبعید کا اس بارے میں امتیاز نہ کرتے اور عدل الٰہی کا اجرا ہر چیز پر مقدم رکھتے تو یہ بدعتیں جاری کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ طرح طرح کے ظالمانہ محصول، ناروا سزائیں، اپنی حفاظت کے لیے غلاموں اور سپاہیوں کے لشکر وغیرہ کچھ بھی نہ کرنا پڑتا۔ جیسا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور بعض دوسرے عادل حکام کا حال تھا۔

کتاب اللہ سے علماء کی دوری

اسی طرح اگر کتاب اللہ کو اپنا رہبر مانتے، اس کی ان آیات بیّنات کا تفقّہ حاصل کرتے جو اللہ تعالیٰ کی حجتیں ہیں، ان کی ہدایت اور رہنمائی جو علم نافع اور عملِ صالح کی صورت میں ہے، اس پر غور کرتے، حکمت الٰہی کو قائم کرتے جسے اللہ نے اپنے رسول کو دے کر بھیجا اور جو سنت نبوی ہے، اگر علماء ان صفات کو اختیار کرتے، تو یقیناً انھیں کتاب اللہ میں گوناگوں علومِ نافعہ کے سرچشمے مل جاتے، جو تمام علوم پر حاوی ہوتے اور تب انھیں حق و باطل میں تمیز کی قدرت حاصل ہو جاتی اور اس آیت:

﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ﴾

"اسی طرح ہم نے تمھیں درمیانی امت بنا دیا۔ (جس میں کوئی افراط وتفریط نہیں) تا کہ تم سب لوگوں پر گواہ بنو۔"[1]

اس آیت کے مطابق تمام مخلوق پر شاہد بن جاتے۔ نیز ان تمام فاسد دلائل سے مستغنی ہو جاتے جن سے اصحابِ کلام کے زعم میں دین الٰہی کی تائید ہوتی ہے اور ان فاسد آرا سے

---

[1] البقرۃ 143:2

بھی بے نیاز ہو جاتے کہ جن کے ذریعے سے اہلِ قیاس کے دعوے کے مطابق فروع دین کی تکمیل ہوتی ہے، حالانکہ ہر صحیح دلیل اور ہر صحیح رائے کی اصل، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں موجود ہے۔ سمجھنے والے اسے سمجھ لیتے ہیں اور محروم ہونے والے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔

صوفیوں کی گمراہی

اسی طرح اگر عابد لوگ ظاہر اور باطن میں انھی اقوال و اعمال کے ساتھ عبادت کرتے جو مشروع ہیں اور اس کلام طیب و عمل صالح سے لذت شناس ہوتے جسے لے کر اللہ کے رسول ﷺ تشریف لائے تو یقیناً اس میں انھیں ایسے احوال ذکیہ، مقامات عالیہ اور نتائج عظیمہ حاصل ہوتے جو بدعتوں سے انھیں مستغنی کر دیتے اور سماع قرآن سے روکنے والی قوالیوں، خود ساختہ اذکار اور وظائف میں سے کسی چیز کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔

کسی کا قول و فعل واجب الاتباع نہیں

یہ تمام بدعیہ عبادتیں ان لوگوں نے ایجاد کی ہیں جو شریعت کے مقررہ راستے پر پوری طرح استوار نہ تھے۔ البتہ بعض اوقات بہت سے عابد و عالم بلکہ خود بعض حکام ان بدعتوں کی ایجاد میں اپنے اجتہاد کی بنا پر معذور سمجھے جا سکتے ہیں۔

اصل الاصول یہ ہے کہ صحیح دلیل معلوم کی جائے اگرچہ اس سے روگردانی کرنے والا کبھی اپنے اجتہاد کی بنا پر معذور بھی ہوتا ہے بلکہ کبھی اپنی غلطی کے باوجود صدیقین میں سے ہوتا ہے۔ کیونکہ صدیقین میں سے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہر قول و فعل صحیح ہو اور واجب الاتباع تسلیم کر لیا جائے۔ یہ مقام رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی دوسرے انسان کو

حاصل نہیں۔[1]

یہ باب بہت وسیع ہے۔ بدعت کی اقسام واحکام اور صفات بیان کرنے کی یہ کتاب متحمل نہیں۔ مقصود صرف اس قدر تھا کہ مذکورہ بالا حدیث صحیح کے ساتھ معارضہ آرائی کا شبہ زائل کر دیا جائے اور معلوم ہو جائے کہ بدعت کی مذمت میں نصوص کی پیروی لازم ہے۔

① اگر صدیقین کا یہ حال ہے تو وہ بزرگ کس شمار میں ہیں جن کے اقوال واعمال کو لوگوں نے کلام الٰہی کے مقابلے میں حجت بنالیا ہے۔ گمراہوں کے سامنے کتاب وسنت سے کتنی ہی دلیلیں پیش کریں وہ ان سب کو یہ کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ نے یہ کہا ہے اور یہ فرمایا ہے، حالانکہ جسے وہ بزرگ سمجھ رہے ہیں خود اس کی بزرگی بھی یقینی نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہ ریاکار ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفر یا نفاق پر مرا ہو۔ اگر اس کی بزرگی ثابت بھی ہو جائے تو بھی اس کا قول وفعل شریعت میں دلیل نہیں ہو سکتا۔ لیکن لوگ یہ موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ حتیٰ کہ ایک مشہور مسلمان لیڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ قرآن وحدیث کے مقابلے میں وہ اپنے مرشد کے حکم کو ترجیح دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص کو معاف کرے۔ اس غریب کو معلوم نہیں کہ یہ کہنا صریح کفر ہے۔

بدعت کے نقصانات

پھر ان بدعتی عیدوں اور تہواروں میں دین کے لیے مضرت ونقصان اور فساد ہے۔ اکثر لوگ اس قسم کی بدعتوں کے فساد کا صحیح ادراک نہیں کر پاتے، صرف اور صرف عقل وشعور والے حضرات ہی سے ممکن ہے کہ وہ بعض نقصانات کا ادراک کرسکیں۔ اس لیے سب پر لازم ہے کہ کتاب وسنت ہی کی پیروی کریں کیونکہ اس میں کسی فساد کا احتمال نہیں اس لیے اس پر عمل کریں، خواہ ان کو اس شرعی ثابت شدہ حکم کی مصلحت معلوم ہو سکے یا نہ۔

آئندہ سطور میں ہم بعض مفاسد کی طرف اشارہ کررہے ہیں:

جب آدمی کسی خاص دن کے لیے کوئی عمل مخصوص کر لیتا ہے جیسا کہ لوگوں نے رجب کی پہلی جمعرات کو روزے کے لیے خاص کرلیا ہے اور اس کے بعد رات میں خاص طور پر نماز پڑھتے ہیں، جس کا نام انھوں نے ''صلوۃ الرغائب'' رکھا ہوا ہے۔ پھر ان بدعتوں کے لوازم مثلاً طرح طرح کے کھانے پکانا، اچھے کپڑے پہننا، اسراف کرنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جن کے ساتھ دل میں کوئی نہ کوئی اعتقاد بھی موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے دل میں یہ یقین سا پیدا ہوتا ہے کہ یہ خاص دن دوسرے دنوں سے افضل ہے اور یہ کہ اس دن روزہ رکھنے کا ثواب اس سے پہلے اور بعد میں آنے والی جمعرات کے دنوں میں روزہ رکھنے سے زیادہ ہے، اور یہ کہ اس جمعہ کی رات باقی راتوں سے افضل ہے اور اس میں نماز ادا کرنا باقی جمعوں والی دوسری راتوں سے خاص طور پر اور جمعہ کے علاوہ باقی دنوں کی راتوں سے عام طور پر زیادہ

ثواب کا موجب ہے کیونکہ اگر اس قسم کا اعتقاد دل میں موجود نہ ہو تو اس دن یا رات کے کسی خاص عمل میں جوش اور سرگرمی پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ ترجیح بلا مرجح ممکن نہیں۔

جمعہ کا روزہ

نبیٔ کریم ﷺ نے اس طرح اوقات کو نماز کے ساتھ اور دنوں کو روزے کے ساتھ مخصوص کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کی رات کو نماز کے لیے اور جمعہ کے دن کو روزے کے لیے خاص نہ کرو، اِلّا یہ کہ وہ روزے کے دنوں میں اتفاقیہ آ جائے۔''[1] اور صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ''خاص جمعہ کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے، اِلّا یہ کہ اس سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھے۔''[2] صحیح بخاری میں حضرت جویریہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ ان کے گھر جمعہ کے دن تشریف لائے۔ وہ روزے سے تھیں، آپ نے دریافت کیا ''کیا کل روزہ رکھا تھا؟'' انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا: ''کیا کل بھی روزہ رکھنے کا ارادہ ہے؟'' انھوں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا: ''تو روزہ افطار کر ڈالو۔''[3] صحیحین میں محمد بن عباد سے مروی ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا: کیا رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے منع کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ''ہاں! قسم ہے اس گھر کے

---

[1] صحيح مسلم، الصيام، باب كراهة إفراد يوم الجمعة ...... الخ، حديث: 1144

[2] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم الجمعة ...... الخ، حديث: 1985 و صحيح مسلم، الصيام، باب كراهة إفراد يوم الجمعة ...... الخ، حديث: 1144

[3] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم الجمعة ...... الخ، حديث: 1986

مالک کی۔‘‘ [1] صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’رمضان سے پہلے خاص طور پر ایک یا دو دن کا روزہ نہ رکھو اِلّا یہ کہ کوئی آدمی اپنے معمول کے مطابق کسی دن کا روزہ رکھتا چلا آ رہا ہو تو وہ رکھ لے۔‘‘ [2]

روزے کے لحاظ سے دنوں کی تقسیم

شارع علیہ السلام نے روزے کے لحاظ سے دنوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ ایام ہیں، جن میں روزہ رکھنا مشروع ہے خواہ وجوب کے طور پر مثلاً رمضان کا مہینہ یا استحباب کے طور پر جیسے عرفہ اور عاشورہ کے دن کا روزہ۔ [3] دوسری قسم ان دنوں کی ہے جن میں روزہ رکھنے سے بالکل منع کیا گیا ہے جیسے عیدین کے دن۔ [4] اور تیسری قسم میں وہ دن شامل ہیں جنھیں روزے کے ساتھ مخصوص کرنے سے منع کیا گیا ہے مثلاً جمعہ۔ [5] اور شعبان کے آخری دن۔ [6] اگر اس تیسری قسم کے دنوں کے ساتھ دوسرے دنوں کو ملا کر روزہ رکھا جائے تو مکروہ نہیں لیکن

---

[1] صحیح البخاری، الصوم، باب صوم یوم الجمعة ...... الخ، حدیث:1984و صحیح مسلم، الصیام، باب کراهة إفراد یوم الجمعة ...... الخ، حدیث: 1143

[2] صحیح البخاری، الصوم، باب لایتقدم رمضان بصوم یوم ولا یومین، حدیث: 1914 صحیح مسلم، الصیام، باب لا تقدموا رمضان بصوم یوم ولا یومین، حدیث: 1082

[3] صحیح مسلم، الصیام، باب استحباب صیام ثلاثة أیام...... الخ، حدیث: 1162

[4] صحیح البخاری، الصوم، باب صوم یوم الفطر، حدیث: 1990 - 1995 وصحیح مسلم، الصیام، باب تحریم صوم یومي العید، حدیث: 1137-1140

[5] صحیح مسلم، الصیام، باب کراهة إفراد یوم الجمعة ...... الخ، حدیث 1144

[6] صحیح البخاری، الصوم، باب لا یتقدم رمضان بصوم یوم ولا یومین، حدیث:1914و صحیح مسلم، الصیام ، باب لاتقدموا رمضان بصوم یوم ولا یومین، حدیث:1082۔ البتہ اگر کسی شخص کی مستقل عادت چلی آ رہی ہے تو وہ رکھ لے دیکھیے: صحیح البخاری، الصوم، باب الصوم من آخر الشهر، حدیث:1983و صحیح مسلم، الصیام، باب صوم سرر شعبان، حدیث:1161

جب صرف ان کو عملی طور پر خاص کر لیا جائے تو ممنوع ہو جاتا ہے، خواہ روزہ رکھنے والے کی نیت تخصیص کی ہو یا نہ ہو اور چاہے ترجیح کا اعتقاد ہو یا نہ ہو۔

ظاہر ہے اس عمل (روزے کو جمعے کے دن کے ساتھ خاص کرنے) میں جو فساد ہے وہ صرف تخصیص کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس فعل سے بالکل منع کر دیا جاتا جیسے کہ عید کے دن کا روزہ ممنوع ہے یا سرے سے منع ہی نہ کیا جاتا جیسے یومِ عرفہ کا روزہ۔ اس فعل یعنی روزے میں بجائے خود کوئی فساد نہیں، اس لیے یہ عمل ہر وقت کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ تخصیص نہ ہو۔

فساد کی علت

اس سے ظاہر ہوا کہ جس دن کو شارع علیہ السلام نے کوئی خصوصیت نہیں دی، اس میں خصوصیت پیدا کرنے کی وجہ سے فساد آ جاتا ہے۔ چونکہ جمعے کا دن ایسے فضائل والا دن ہے جو دوسرے دنوں کو حاصل نہیں۔ اس میں خاص طور پر نماز، دعا، ذکر، قراءت، طہارت، خوشبو اور زینت کو مستحب قرار دیا گیا ہے، اس لیے شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اس دن کے روزے کی طرح اس کی رات میں نماز بھی دوسری راتوں سے افضل ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے اس تخصیص سے منع کر دیا[1] کہ یہ تو فساد کا موجب ہے۔

اسی طرح شعبان کے آخری ایک یا دو دنوں کے روزے سے منع کر دیا گیا[2] جن کو کسی خاص ثواب یا احتیاط کے خیال سے رکھا جاتا ہے کہ ممکن ہے چاند نظر آ گیا ہو۔ چونکہ شریعت میں ایسا کرنے کو ثواب قرار دیا گیا ہے نہ احتیاط، اس لیے اس سے بھی رسول اللہ ﷺ نے

---

① صحيح مسلم، الصيام، باب كراهة إفراد يوم الجمعة ...... الخ، حديث:1144

② صحيح البخاري، الصوم، باب لا يتقدم رمضان بصوم يوم ولا يومين، حديث:1914 صحيح مسلم، الصيام، باب لا تقدموا رمضان بصوم يوم ولا يومين، حديث:1082

منع فرمادیا۔

ہمارے پیش نظر مسئلے میں بھی یہی معنی موجود ہے۔لوگ ان تہواروں اور میلوں کو اس لیے خصوصیت دیتے ہیں کہ ان کے اعتقاد میں وہ کوئی نہ کوئی فضیلت رکھتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوچکا ہے کہ جب کسی وقت کو روزے یا نماز کے ساتھ خاص کردیا جائے اور یہ اعتقاد رکھا جائے کہ ایسا کرنے میں خاص ثواب ہے تو اس تخصیص سے منع کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسی تخصیص کی خاص ثواب کے اعتقاد کے بغیر نوبت ہی نہیں آتی، اس لیے یہ ممنوع ہے۔

تقرب الٰہی کا ذریعہ

لیکن اگر کوئی کہے کہ ''اس خاص وقت یا دن میں نماز یا روزہ میرے خیال میں باقی اوقات وایام کی طرح ہے لیکن اس کے باوجود میں اس وقت یا دن کو خصوصیت دیتا ہوں'' تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ اس کے اس فعل کی وجہ یا تو کسی دوسرے آدمی کی تقلید ہوگی، یا عادت کی پابندی، یا لوگوں کی ملامت کا خوف، یا اسی طرح کا کوئی اور سبب اس کے پیش نظر ہوگا، ورنہ وہ جھوٹا ہے کیونکہ اس غیر شرعی عمل کا موجب یا تو یہ فاسد اعتقاد ہوگا یا اور کوئی غیر دینی سبب۔ بہر حال وہ اعتقاد گمراہی ہے۔

ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمۂ دین رحمۃ اللہ علیہم میں سے کسی نے بھی اس دن اور رات کی فضیلت اور خاص طور پر اس کے روزے اور نماز (صلوٰۃ الرغائب) کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں کہا ہے اور اس کے متعلق پیش کی جانے والی روایت موضوع اور من گھڑت ہے۔ اسلام میں یہ چیز سرے سے موجود نہ تھی بلکہ چوتھی صدی کے بعد ایجاد کی گئی ہے۔ لہٰذا کسی طرح بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ اس میں ذرہ برابر بھی کوئی فضیلت اور ثواب ہوسکتا ہے۔

اگر نبیٔ کریم ﷺ آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم تابعین اور جملہ ائمہ رحمۃ اللہ علیہم اس بات سے ناواقف تھے تو ہمارے لیے کیسے ممکن ہے کہ ہمیں اس کا علم ہوگیا ہو۔ تقرب اِلی اللہ کے جس ذریعے کا علم رسول اللہ ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور ائمہ رحمۃ اللہ علیہم کو حاصل نہ تھا وہ بھلا ہمیں کیونکر حاصل ہوسکتا ہے؟

اگر کہا جائے کہ انھیں اس بات کا علم تھا، تو اسے بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عمل صالح کے لیے ان کی سرگرمیاں اور لوگوں کی تعلیم ونصیحت کے لیے ان کے ولولے دیکھتے ہوئے ہرگز گمان نہیں کیا جاسکتا کہ وہ علم رکھنے کے باوجود کسی ایک شخص کو بھی اس سے آشنا نہ کرسکے اور خود ان میں سے کوئی ایک متنفس بھی اس پر کبھی عمل نہ کرسکا۔ جب فضیلت وثواب کا یہ دعویٰ دینی معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے علم اور خیر القرون کے علم کی نفی کو مستلزم ہے، یا یہ دعویٰ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اسے چھپائے رکھا یا ترک کردیا تھا۔ حالانکہ ان کی شریعت دوستی اور عادت کا تقاضا تھا کہ وہ اسے نہ چھپاتے اور نہ ترک کرتے، تو ظاہر ہے اس کا معاملہ کس درجہ سخت ہوجاتا ہے؟ کیونکہ یہ دونوں باتیں (عدمِ علم یا کتمانِ علم) بالکل غلط اور خلاف واقع ہیں۔ اگر یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں تو پھر وہ دعویٰ بھی باطل ہوجاتا ہے جس سے یہ دونوں باتیں لازم آتی ہیں۔

بدعت کے ساتھ باطل اعتقاد ضرور ہوتا ہے

پھر یہ بدعتی کسی نہ کسی باطل اعتقاد کو لازم قرار دیتا ہے جو دین میں گمراہی کا باعث ہے یا غیراللہ کے لیے عمل کو ضروری ٹھہراتا ہے اور یہ دونوں ناجائز ہیں۔ تمام بدعتوں کا یہی حال ہے کہ وہ ضرور کوئی نہ کوئی ایسا فعل اپنے ساتھ لاتی ہیں جو ناجائز ہوتا ہے، اگر وہ حرام نہ بھی ہو تو کم ازکم کراہت سے خالی نہیں ہوتیں۔

پھر اس اعتقاد کے ساتھ دل میں طرح طرح کے احوال پیدا ہوجاتے ہیں، غلط تعظیم واجلال

کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ یہ تمام احوال و کیفیات باطل ہیں اور ان کا دینِ الٰہی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اگر کوئی کہے کہ میں اس فعل میں ذرا بھی فضیلت پر یقین نہیں رکھتا، تو بھی وہ اسے عبادت بنا لینے کی حالت میں اپنے دل سے اس کی تعظیم وتوقیر کا احساس دور نہیں کر سکتا۔ اور معلوم ہے کہ یہ تعظیم کا احساس اسی سرچشمے سے پیدا ہوتا ہے جو اعتقاد کا سرچشمہ ہے، پھر کبھی یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی فعل کو بدعت سمجھتا ہے مگر اس علم کے باوجود اس کی تعظیم کرتا ہے کیونکہ اس کے متعلق موضوع روایتیں سنتا ہے، یا اس عمل کو کرتے ہوئے عوام کو، یا ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنھیں مقدس سمجھتا ہے، یا اس میں کوئی مصلحت نظر آتی ہے۔

بدعت کا نتیجہ، نفاق

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ یہ بدعتیں واجب اعتقادات اور رسولوں کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں اور وہ دل میں نفاق پیدا کر دیتی ہیں، خواہ وہ خفیف سا ہی نفاق کیوں نہ ہو۔ ان بدعتوں کے ماننے والوں کی حالت ان لوگوں کے مشابہ ہے جو ابو جہل اور عبداللہ بن ابی (رئیس المنافقین) وغیرہ کی تعظیم ان کی سرداری و دولت مندی، حسب ونسب اور سخاوت و وجاہت کی وجہ سے کرتے تھے اور جب رسول اللہ ﷺ ان سرداروں کی مذمت کرتے تھے، یا ان کی توہین یا قتل کا حکم دیتے تھے تو جن لوگوں کے دل خالص ایمان کے نور سے منور نہیں ہوئے تھے، تردد میں پڑ جاتے تھے۔ ایک طرف رسول کی اطاعت ضروری سمجھتے تھے اور دوسری طرف اوہام وخیالات کی گرفت میں پھنسے ہوئے تھے۔ تھوڑے سے غور وفکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بدعتوں میں ایمان کے لیے کیسے کیسے زہر پنہاں ہیں؟ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ''بدعت کفر کی شاخ ہے۔''

شرعی فضیلت کا اثبات

یہ معانی جو میں نے بیان کیے ہیں ان تمام عبادتوں میں ملحوظ ومعتبر ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے منع کر دیا ہے اور جنھیں شریعت میں کوئی امتیاز حاصل نہیں مثلاً قبروں کے پاس نماز پڑھنا، بتوں کے پاس قربانی کرنا وغیرہ۔ یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح شریعت کی ٹھہرائی ہوئی فضیلت کا اثبات وقیام مقصود ہے اسی طرح غیر شرعی فضیلت کا ابطال وازالہ بھی مقصود ہے۔ بعض افعال ایسے ہیں کہ ان میں بظاہر ہر فضیلت معلوم ہوتی ہے، لیکن فضیلت حقیقت میں وہی ہے جو شریعت نے تسلیم کر لی ہے۔

بدعتی عیدوں میں روحانی فوائد

اگر اعتراض کیا جائے کہ تمھاری یہ تشریح کیونکر قبول کی جا سکتی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اعیاد ومواسم ایسے لوگوں نے بھی منائے ہیں جو علم وفضل سے متصف اور صدیقین کے زمرے میں آتے تھے، پھر ان تہواروں اور میلوں میں روحانی فوائد بھی موجود ہیں جن سے مومن کے دل میں طہارت اور رقت پیدا ہوتی ہے، گناہوں کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دعائیں قبول ہوتی ہیں اور قرآن وحدیث کے عمومی دلائل بھی ان پر دلالت کرتے ہیں جن میں نماز اور روزے کی فضیلت بیان ہوئی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَىٰ عَبْدًا إِذَا صَلَّىٰ﴾ ”یعنی کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو بندے کو اس وقت روکتا ہے جب وہ نماز پڑھتا ہے؟“[1] اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اَلصَّلَاةُ نُورٌ وَّبُرْهَانٌ۔“[2] ”یعنی نماز نور کا باعث

---

[1] العلق 10,9:96

[2] یہ الفاظ تو کہیں نہیں مل سکے البتہ امام مسلم نے ”اَلصَّلَاةُ نُورٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ ...... الخ“ کے الفاظ ذکر کیے ہیں یعنی نماز نور ہے اور صدقہ برہان ودلیل ہے۔ دیکھیے: صحیح مسلم، الطهارة، باب فضل الوضوء، حدیث:223

ہے اور یہ دلیل ہے۔“

ہمارا جواب یہ ہے کہ جو کوئی عیدیں مناتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی تاویل رکھتا ہے، خواہ وہ اس تاویل میں مجتہد ہو یا مقلد، تو اسے اس کی نیک نیتی کا اور ان اعمال کا ثواب ملتا ہے جو مشروع ہیں۔ اور جو اعمال محض بدعت کے کام ہیں ان کو بخش دیا جائے گا بشرطیکہ وہ اپنے اجتہاد یا تقلید میں اس درجے پر ہو جس میں آدمی معذور ہوتا ہے۔ باقی رہے روحانی فوائد جو ان تہواروں میں بتائے جاتے ہیں، سو وہ صرف اس لیے حاصل ہوتے ہیں کہ ان میں مشروع اعمال بھی کیے جاتے ہیں۔ مثلاً روزہ، ذکر و تلاوت، رکوع و سجود، عبادت و دعا اور اطاعت میں حسن قصد، اور جو مکروہ اعمال کیے جاتے ہیں ان کو آدمی کے اجتہاد یا تقلید کی وجہ سے عفوِ الٰہی شامل حال ہو جاتی ہے۔ یہ بات ان تمام بدعتوں میں یاد رکھنی چاہیے جن میں بعض فوائد بیان کیے جاتے ہیں۔

لیکن صرف اس بنا پر ان بدعتوں کی نہ کراہت دور ہو سکتی ہے اور نہ ان کی ممانعت میں فرق آ سکتا ہے بلکہ ہمیشہ اسی بات پر زور دیا جائے گا کہ انھیں چھوڑو اور ان کے بدلے مشروع اعمال اختیار کرو جن میں بدعت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ محض کسی فائدے کا حصول، بدعت کو مباح نہیں بنا سکتا۔ جن لوگوں نے عیدین میں اذان زیادہ کر دی تھی وہ بھی اس میں فائدہ محسوس کرتے تھے، بلکہ یہود و نصاریٰ بھی اپنی طرف سے زیادہ کی ہوئی عبادتوں میں فوائد پاتے ہیں۔

اور یہ اس لیے کہ ان کی عبادات کا کوئی نہ کوئی جز اور حصہ مشروع ہوتا تھا اور ان کے اقوال میں کوئی نہ کوئی بات انبیاء علیہم السلام کی صداقت سے ضرور ماثور ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود کوئی بھی یہ جائز نہیں سمجھتا کہ ان کی عبادتیں اختیار کر لی جائیں اور ان کی باتیں روایت کی جائیں کیونکہ تمام بدعتوں میں شر کا پلہ خیر کے پلے سے بھاری ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر ان میں خیر

زیادہ ہوتی تو شریعت ان کو نظر انداز ہی نہ کرتی۔ کسی بات کا بدعت ہونا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس میں نقصان اور گناہ کی مقدار ان کے نفع سے زیادہ ہے اور ان سب افعال سے انکار کرنے کی وجہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ

پھر میں کہتا ہوں کہ ان بدعتوں پر عمل کا گناہ بعض لوگوں سے ان کے اجتہاد یا ایسے ہی کسی خاص سبب سے دور ہوسکتا ہے لیکن اس کے باوجود ان بدعتوں کی حقیقت بیان کرنا واجب ہے اور جن لوگوں نے انھیں مباح سمجھا ہے ان کی پیروی نہ کرنا بھی لازم ہے، اگر چہ وہ اپنے وقت کے کتنے ہی بزرگ کیوں نہ ہوں کیونکہ اگر انھوں نے ان بدعتوں پر عمل کیا ہے تو انھی کے زمانے میں اکثر نے انھیں مکروہ بھی سمجھا اور ان پر عمل بھی نہیں کیا اور ان کو مکروہ سمجھنے والے یہ لوگ اگر ان سے افضل نہ تھے تو کم تر بھی نہ تھے اور اگر کم تر مان بھی لیے جائیں تو چونکہ اولوا الامر میں اختلاف پیدا ہوگیا ہے، اس لیے معاملے کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں فیصلے کے لیے پیش کرنا چاہیے۔ اور یہ عیاں ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کا فیصلہ ان لوگوں کے حق میں ہے جنھوں نے ان اعمال کو مکروہ سمجھا، نہ کہ ان لوگوں کے حق میں جنھوں نے انھیں مباح قرار دیا۔ نیز تمام متقدمین بھی جو متاخرین سے افضل تھے، مکروہ سمجھنے والوں کی صف میں نظر آتے ہیں۔

بدعت کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ

پھر ان بدعات کا جو کچھ نفع بیان کیا جاتا ہے اس کے مقابلے میں بہت سی بربادیاں بھی ان بدعتوں میں موجود ہیں۔ یہی نقصان کیا کم ہے کہ دل ان کے گرویدہ ہوکر بہت سی سنتوں سے

غافل و مستغنی ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ عوام کو دیکھو کہ جس ذوق وشوق سے ان بدعتوں کی پابندی کرتے ہیں وہ فرض اور تراویح کی نمازوں میں ظاہر نہیں کرتے۔

عوام ہی نہیں، بہت سے خواص بھی ان بدعتوں کے لیے غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں جسے دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ وہ انھی کو عبادت سمجھتے ہیں اور فرائض کو محض عادتاً انجام دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ صورتِ حال دین کے خلاف ہے۔ اس طرح فرائض وسنن کے تمام فوائد مثلاً بخشش و مغفرت، رحمت، رقت، طہارت و پاکیزگی، خشوع و خضوع، دعا کی قبولیت، عبادت کی حلاوت، غرضیکہ جملہ فوائد کا فقدان ہو جاتا ہے اور اگر جملہ فوائد کا نقصان نہیں تو ان کی روح وکمال کا فقدان یقینی ہے۔

ایک نقصان یہ بھی ہے کہ معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھ لیا جاتا ہے اور جاہلیت پھیل جاتی ہے۔ اسی طرح شریعت کے کئی ایک مکروہ کام رواج پا جاتے ہیں مثلاً تاخیر سے روزہ افطار کرنا، عشاء کو مسلسل جلدی پڑھتے رہنا اور وہ اذکار و وظائف کرنا جن کی کوئی اصل نہیں۔ نیز طبیعت میں اتباع کا رجحان کم ہو جاتا ہے اور وہ خود کو شریعت کی پابندیوں سے آزاد محسوس کرتی ہے۔ بدعت کی مذمت میں اتنا بیان کافی ہے۔ مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ لہٰذا اب ہم ان عیدوں میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

زمانی ومکانی عیدیں

”عید“ کے معنی ہیں بار بار لوٹنا، چنانچہ ہر وہ مقام عید ہے جہاں لوگ بار بار جاتے ہیں، ہر وہ زمانہ بھی عید ہے جس میں بار بار کوئی خاص کام کیا جاتا ہے اور ہر وہ اجتماع بھی عید ہے جو بار بار پیش آتا ہے۔ ان تینوں قسموں میں بدعتیں ایجاد کر لی گئی ہیں۔ چنانچہ عید زمانی کی تین قسمیں ہیں:

1. ایسے دنوں کی تعظیم جنھیں شریعت نے کوئی اہمیت دی نہ سلف صالحین میں ان کا کوئی چرچا تھا اور نہ ان میں کوئی ایسی بات پیش آئی جس کی وجہ سے ان کی تعظیم کی جائے مثلاً

رجب کی عیدیں

ماہ رجب کی پہلی جمعرات اور اس کے بعد جمعہ کی رات، جسے عوام ”رغائب“ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، اس دن اور رات کی تعظیم اسلام میں نہیں ہے بلکہ چوتھی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں میں شروع ہوئی ہے۔ اس بارے میں ایک حدیث بھی روایت کی جاتی ہے جو علماء کے نزدیک متفقہ طور پر موضوع ہے[1]۔ اس حدیث میں اس دن کے روزے اور اس رات کی نماز کی فضیلت بیان کی گئی ہے حالانکہ یہ روزہ اور یہ نماز دونوں بدعت ہیں، لہٰذا ان سے اور ان میں کیے جانے والے افعال مثلاً خصوصی کھانے کا انتظام اور اظہار زینت وغیرہ سے منع کرنا

---

[1] دیکھیے: ابن الجوزی کی الموضوعات :2/47 اور سیوطی کی اللآلي المصنوعة :2/56۔

ضروری ہے بلکہ اس دن اور اس رات کو باقی تمام دنوں اور راتوں کی طرح سمجھنا چاہیے اور ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے کوئی تخصیص یا امتیاز پیدا ہو۔

اسی طرح رجب کے وسط میں ایک دن کی تعظیم کی جاتی ہے اور اس میں خاص نماز پڑھی جاتی ہے جسے ''صلاۃ ام داود'' کہتے ہیں، حالانکہ اس دن کی بھی شریعت میں کوئی بنیاد نہیں ہے۔

2. ایسے دن کی تعظیم جس میں کوئی خاص واقعہ پیش آیا مگر اس کی وجہ سے اس دن کو کوئی خصوصیت یا فضیلت حاصل نہیں ہوئی، کیونکہ اس جیسے واقعات دوسرے دنوں میں بھی پیش آچکے ہیں۔ مثلاً......

عید غدیر خم

اٹھارہ ذی الحجہ دس ہجری کو نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپس آتے ہوئے ''غدیر خم'' کے مقام پر خطبہ دیا تھا اور خطبہ میں کتاب اللہ کی اتباع کی وصیت کی تھی، نیز اپنے اہل بیت کے متعلق بھی وصیت کی تھی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔[1]

لیکن بعض لوگوں نے اس میں طرح طرح کے اضافے کر دیے ہیں حتیٰ کہ یہ دعوی کر بیٹھے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا واضح طور پر حکم دیا تھا اور انھیں بلند جگہ پر بٹھایا تھا لیکن بعد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ساز باز کر کے یہ وصیّت چھپا ڈالی، وصی کا حق غصب کر لیا اور فسق و کفر میں پڑ گئے! حالانکہ اگر اس طرح کی کوئی بات ہوئی ہوتی تو اس کا چھپانا ناممکن تھا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کی دیانتداری اور ایمانداری دیکھتے ہوئے ایک لمحے بھی تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ایسا کیا ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، فضائل الصحابۃ، باب من فضائل علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ، حدیث: 2408

یہاں مسئلہ امامت پر بحث مقصود نہیں، صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اس دن کو عید قرار دینا بدعت ہے، کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی اصل موجود نہیں۔ اسے سلف صالحین رحمہم اللہ نے عید سمجھا نہ اہلِ بیت میں سے کسی نے خیال کیا کہ اس کی تعظیم وتخصیص کرنی چاہیے۔ عیدیں وہی ہیں جو مشروع کردی گئی ہیں، لہٰذا اس بارے میں اتباع چاہیے نہ کہ ابتداع۔

اور اگر محض غدیر خم میں خطبے کی وجہ سے اس دن کو کوئی خصوصیت حاصل ہوسکتی ہے تو دوسرے ایام میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے دیے ہیں۔ وصیتیں کی ہیں اور اہم واقعات پیش آئے مثلاً وہ دن جس میں بدر، حنین، خندق، فتح مکہ، ہجرت اور مدینہ میں داخلہ جیسے عظیم الشان واقعات پیش آئے لیکن محض ان واقعات کی وجہ سے ان دنوں کو عید قرار نہیں دیا گیا۔

اس طرح کے کام تو نصاریٰ کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تاریخی ایام کو عید بنا لیتے ہیں، یا یہ یہود کا طریقہ ہے۔ اسلام میں تو عید، شریعت کے حکم پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس دن کو مقرر کردیا ہے، بس وہی عید ہے۔ اسی کو منانا چاہیے اور نئی نئی عیدیں ایجاد کر کے دین میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔

میلاد

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے دن کی تعظیم کا معاملہ ہے۔ مسلمان یہ چیز یا تو عیسائیوں کی تقلید میں کرتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یومِ ولادت میں عید مناتے ہیں یا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وتعظیم کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بدعت پر نہیں بلکہ اس محنت اور اجتہاد پر انھیں ثواب دے گا[1] لیکن اس دن کو عید نہیں بنانا چاہیے کیونکہ

[1] لیکن جسے معلوم ہوجائے کہ یہ چیز بدعت ہے اور اس کے باوجود بھی اس کا مرتکب ہو تو ایسی صورت میں ثواب نہیں بلکہ اللہ کی ناخوشی کا اندیشہ ہے۔

نبیٔ اکرم ﷺ کی تاریخ ولادت میں اختلاف ہے۔ پھر سلف نے اسے عید نہیں بنایا، حالانکہ اس کا مقتضٰی موجود تھا اور مانع معدوم۔ اگر ایسا کرنا اچھا ہوتا یا اس میں کچھ بھی خوبی ہوتی تو سلف صالحین ہم سے کہیں زیادہ اس کا اہتمام کرتے کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کی محبت و تعظیم سے سرشار اور نیکی کی طرف ہم سے زیادہ تیز قدم تھے لیکن انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

رسول اللہ ﷺ سے محبت کا طریقہ

رسول اللہ ﷺ سے محبت و تعظیم کے اظہار کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ میلاد کی محفلیں رچائی جائیں بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ظاہر اور باطن میں آپ کی پیروی کی جائے، اطاعت کی جائے، آپ کے احکام کی پیروی کی جائے، آپ کی سنت زندہ کی جائے، آپ کی لائی ہوئی ہدایت پھیلائی جائے اور اس راہ میں دل، ہاتھ اور زبان سے جہاد کیا جائے۔ یہی راہ سابقین اولین کی تھی، اسی طریقے پر مہاجرین وانصار چلتے تھے اور ان کے بعد اسی پر تمام سلف صالحین رحمہم اللہ قائم تھے۔

بدعت میں جوش رکھنے والے

عام طور پر جو لوگ اس قسم کی بدعتوں میں جوش رکھتے ہیں، اگرچہ انھیں ان کی نیک نیتی اور اجتہاد پر ثواب ملے گا، مگر وہ شریعت کی اتباع میں بہت پیچھے ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو قرآن پر سونا چاندی چڑھاتا ہے مگر تلاوت نہیں کرتا، یا تلاوت کرتا ہے مگر عمل نہیں کرتا اور اس شخص کی طرح ہے جو مسجد آراستہ کرتا ہے مگر نماز نہیں پڑھتا، یا کم پڑھتا ہے اور اس شخص کے مانند ہے جو مسجد میں چراغاں کرتا ہے اور پرتکلف قالین بچھاتا ہے۔ اس قسم کی نمایاں آرائش وزیبائش مشروع نہیں۔ ان سے ریا اور تکبر پیدا ہوتا ہے اور وہ آدمی کو

اپنے اندر الجھا کر مشروع اعمال سے غافل اور فساد کی تخم ریزی کرتی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ''جب کسی قوم کے اعمال بگڑ جاتے ہیں تو وہ مسجدوں کو آراستہ کرنے میں مصروف ہو جاتی ہے۔''[1]

اہم نکتہ

یہاں یہ اہم نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن میں خیر وشر دونوں موجود ہوتے ہیں۔ خیر اس لیے کہ ان میں ایک حصہ شرعی عمل کا ہوتا ہے اور شر اس وجہ سے کہ ان میں ایک حصہ بدعت کا ہوتا ہے۔ ایسے اعمال کو ہم خیر کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اگر وہ سراسر خیر ہوں تو ان کے ترک سے خود دین کا ترک اور اس سے اعراض لازم آتا ہے جیسا کہ منافقین و فاسقین کا حال ہے، اس لیے ایسے اعمال شر والے ہی کہلائیں گے۔ بعد کے زمانے میں اکثر مسلمانوں کی حالت یہی ہوگئی ہے اور وہ ایسے اعمال میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

مصلح کے لیے ہدایات

ایسی صورتوں میں اصلاح کے خواہش مند کو دو باتوں پر عمل کرنا چاہیے:

اول یہ کہ اسے پوری مضبوطی کے ساتھ ظاہراً و باطناً سنت کو پکڑنا چاہیے، اسی بات کا اپنے ماتحت اور زیر اثر لوگوں کو حکم دینا چاہیے، نیکی کو پہچاننا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے نیز برائی کو جاننا چاہیے اور اس سے بچنا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ لوگوں کو حتی الامکان سنت کی طرف دعوت دینی چاہیے لیکن اگر دیکھیں کہ کوئی

---

[1] سنن ابن ماجہ، المساجد، باب تشييد المساجد، حديث: 741۔ اس کی سند میں جُبَارہ بن مُغَلِّس کذاب راوی ہے اور ابو اسحاق مدلس ہے اور عنعنہ سے بیان کر رہا ہے۔ لہٰذا نہایت ضعیف روایت ہے۔

شخص مکروہ عمل کا پابند ہے اور اگر اسے اس عمل سے روک دیا جائے گا تو اور بھی زیادہ مکروہ فعل میں مبتلا ہو جائے گا تو اس کو اس مکروہ کام سے بھی زیادہ کراہت والے کام کے ساتھ دعوت نہیں دینی چاہیے، یا ایسے واجب ومندوب کام کو چھوڑنے کے ساتھ دعوت نہیں دینی چاہیے جس کا چھوڑنا اس مکروہ کام کو کرنے سے بھی زیادہ نقصان دہ ہو۔ لیکن اگر بدعت میں کسی قسم کی کوئی بھلائی موجود ہے تو نرمی کے ساتھ اسے شرعی بھلائی سے بدلنے کی کوشش کریں، کیونکہ انسانی طبیعت کوئی بات اسی وقت چھوڑنا پسند کرتی ہے جب اس کی جگہ کوئی دوسری چیز اسے ملتی ہے۔ کسی کے لیے روا نہیں کہ بھلائی چھوڑ دے الاّ یہ کہ اس کی جگہ کوئی ویسی ہی یا اس سے بہتر بھلائی اختیار کرے۔

جس طرح ان بدعتوں کے مرتکب افراد مذمت کے مستحق ہیں اسی طرح سنتوں کے تارک بھی مذمت کے سزاوار ہیں، ہر قسم کی سنت پر عمل کرنا چاہیے۔ بعض سنتیں مطلق طور پر واجب ہیں اور بعض مقید طور پر جیسے کہ نفلی نماز واجب تو نہیں لیکن جو شخص ان کو ادا کرے گا اس پر لازم اور واجب ہو جائے گا کہ اس کے ارکان کا خیال رکھے۔ اس طرح بعض سنتوں کو ہمیشہ چھوڑنا مکروہ ہے اور بعض کو ادا کرنا ائمہ پر واجب ہے اور عوام کو ان پر رغبت دلائی جاتی ہے۔ بدعتوں کا انکار کرنے والوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو خود سنتوں کو ترک کرتے ہیں، یا ان کے حکم میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ شاید ان میں سے اکثر کی حالت ان لوگوں سے بھی بدتر ہے جو ایک گونہ مکروہ عادتوں (بدعتوں) کے خوگر ہو گئے ہیں۔

ہمارا دین امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دو لازم وملزوم بنیادوں پر قائم ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کا قیام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک دوسرے کا قیام نہ ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ منکر سے منع کیا جائے اور معروف کا حکم نہ دیا جائے، جس طرح کہ اللہ کی عبادت کا حکم ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ماسوا اللہ کی عبادت سے منع کرنا چاہیے کیونکہ اصل الاصول شہادت

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ ہے۔ آدمی اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ عمل کریں، نہ کہ عمل ترک کریں۔ اگر کسی عمل کو ترک کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو صرف اس لیے کہ دوسرے عمل کے لیے جگہ خالی ہو۔ چونکہ عمل فاسد عمل صالح کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، اس لیے ان کا ترک ضروری ٹھہرایا جاتا ہے تاکہ عمل کے لیے گنجائش نکلے اور وہ محفوظ رہے۔

پس ولادتِ نبوی کے وقت کی تعظیم اور اسے عید بنانے میں بعض لوگوں کو ثوابِ عظیم حاصل ہوسکتا ہے۔ یہ ثواب ان کی نیک نیتی اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم کی وجہ سے ہوگا لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، بعض لوگوں کے ایسے اعمال بھی قبول ہو جاتے ہیں جو مومن صادق سے قبول نہیں ہوسکتے۔

چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ سے کسی حاکم کے متعلق کہا گیا کہ اس نے قرآن پر ایک ہزار دینار خرچ کیے ہیں۔ آپ نے جواب دیا: ''اسے کچھ نہ کہو یہ افضل اور سب سے بہتر چیز ہے جس پر اس نے سونا خرچ کیا ہے۔'' حالانکہ امام احمد رحمہ اللہ کے مذہب میں قرآن کریم کی آرائش مکروہ ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے قول کی توجیہ یہ ہے کہ یہ عمل اگرچہ فساد سے خالی نہیں تاہم اپنے اندر ایک مصلحت بھی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ لوگ ایسی چیزوں پر اپنی دولت خرچ نہ کریں تو ایسے کاموں پر خرچ کرنے لگیں گے جو بہت زیادہ بُرے ہیں اور اپنے اندر کوئی بھلائی نہیں رکھتے۔ مثلاً اگر یہ شخص قرآن کی تزیین کے بجائے یہی روپیہ فسق وفجور، لہو ولعب، اشعار یا فلسفہ یونان کی کتابوں پر خرچ کرتا تو ظاہر ہے اور بھی زیادہ بُرا ہوتا۔

لہٰذا اے اصلاح کے خواہاں! دین کی حقیقت سمجھیے اور افعال کو دیکھیے کہ ان میں شرعی مصالح کتنے ہیں اور مفاسد کتنے ہیں تاکہ آپ کو معروف کے مراتب اور منکر کے مراتب کی معرفت حاصل ہو اور تصادم کی حالت میں آپ اہم کو غیر اہم پر مقدم رکھ سکیں۔ انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی ہدایت پر عمل کی یہی حقیقت ہے۔ تصادم کی حالت میں زیادہ اہم معروف کو مقدم

رکھنا، زیادہ سخت منکر کو رد کرنا اور زیادہ قوی دلیل کو ترجیح دینا ہی علمائے اسلام کا خاصہ ہے۔

اعمال کے تین مراتب

1. ایسا عمل صالح جو ہر لحاظ سے مشروع ہو اور جس میں ذرا برابر بھی کراہت نہیں۔
2. ایسا عمل جو بعض اعتبار سے یا اکثر اعتبار سے صالح ہو یعنی نیک نیتی کی وجہ سے یا اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کوئی مشروع پہلو بھی رکھنے کی وجہ سے۔
3. وہ عمل جس میں ہرگز کوئی بھلائی نہیں، اس لیے کہ اس سے عمل صالح کا ترک لازم آتا ہے یا اس لیے کہ وہ بذاتِ خود عملِ فاسد ہے۔

پہلا مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر ظاہراً و باطناً، قولاً و فعلاً تمام علمی اور عملی معاملات میں عمل کرنے کا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی معرفت و تعلیم واجب ہے، اسی کا حکم کرنا چاہیے اور اسی پر وجوب و استحباب کے لحاظ سے عمل کرنا چاہیے۔ پہلے پہل مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے اعمال اس سلسلے میں نمونہ ہو سکتے ہیں۔

دوسرا مرتبہ متاخرین کے اعمال میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ علم و عبادت سے نسبت رکھنے والوں اور عوام الناس میں سے اکثر کے اعمال اسی مرتبے میں داخل ہیں، لیکن یہ لوگ ان لوگوں سے بہتر ہیں جو سرے سے عمل صالح کرتے ہی نہیں، یا جن کے اعمال محرمات کی جنس سے ہیں مثلاً کفر، جھوٹ، خیانت اور جہل وغیرہ۔

پس جو لوگ ایسی عبادتیں کرتے ہیں جو اپنے اندر کراہت رکھتی ہیں مثلاً بغیر افطار کے مسلسل روزے رکھنا، راہبوں کی طرح فطری خواہشیں بالکل ترک کر دینا، یا ایسی راتیں عبادت میں گزارنا جو شرعاً کوئی خصوصیت نہیں رکھتیں جیسے رجب کی پہلی رات وغیرہ، تو ان لوگوں کا حال اس آدمی سے بہتر سمجھا جا سکتا ہے جو سرے سے کوئی عمل کرتا ہی نہیں۔ ان مکروہ

اعمال کا انکار کرنے والے اور ان پر اعتراض کرنے والے بہت سے افراد کی حالت یہ ہے کہ خود عبادت الٰہی سے دور رہتے ہیں۔ علم نافع حاصل کرتے ہیں نہ عمل صالح کا شوق رکھتے ہیں۔ وہ اپنے قول سے غیر مشروع امور کی مخالفت کرتے ہیں لیکن اپنے عمل سے مشروع وغیر مشروع دونوں امور کے مخالف بنے ہوئے ہیں۔ مومن کو چاہیے کہ معروف کو پہچانے اور منکر سے پرہیز کرے۔ معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے اور منافقوں کی موافقت اسے اس ذمے داری سے روکے نہ کسی مومن عالم کی مخالفت اس کے لیے رکاوٹ بنے۔

❸ ایسے دنوں کی تعظیم کرنا جو شریعت کی نگاہ میں بھی تعظیم رکھتے ہیں۔ جیسے یوم عاشورا، یوم عرفہ، عیدین کے دونوں دن، ماہ رمضان کا آخری عشرہ، ذوالحجہ کا پہلا عشرہ، جمعے کا دن اور اس کی رات اور ماہ محرم کہ ان ایام کی فضیلت ثابت ہے، لیکن ان میں بھی لوگ طرح طرح کی بدعتیں کرتے ہیں جن سے روکنا ضروری ہے۔

یوم عاشورا

یوم عاشورا میں لوگوں نے کئی ایک بدعات جاری کر رکھی ہیں مثلاً پیاسے رہتے ہیں، رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں اور جمع ہوکر مجالس منعقد کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ اعمال سراسر بدعت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم دیا ہے نہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی اجازت دی ہے، سلف صالحین نے کبھی یہ اعمال کیے نہ ہی اہل بیت نے۔

یہی وہ دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کے نواسے، نوجوانانِ جنت کے سردار حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے اہلِ بیت میں سے ایک جماعت کو شہادت سے مشرف فرمایا تھا۔ جن فاجروں نے یہ ظلم کیا تھا اللہ تعالیٰ نے انھیں ذلیل ورسوا کر دیا۔ یہ واقعہ تمام مسلمانوں کے لیے اگرچہ غمناک تھا لیکن اسے اسی طرح برداشت کرنا چاہیے تھا جس طرح

باقی تمام مصائب کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡهِ رَاجِعُوۡنَ﴾ کہہ کر صبر کرنا چاہیے تھا، لیکن بدعتیوں نے حکمِ الٰہی کے خلاف طرح طرح کی بدعتیں پیدا کر دیں۔ اسی قدر نہیں بلکہ اس واقعہ سے بالکل بری الذمہ صحابہ رضی اللہ عنہم پر جھوٹ اور بہتان باندھنے کا بھی الزام لگا دیا۔

حالانکہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی فاطمہ رحمها اللہ اپنے والد سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس کسی کو مصیبت پیش آئے اور وہ ہر مرتبہ یاد آنے پر ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡهِ رَاجِعُوۡنَ﴾ پڑھے، تو خواہ وہ مصیبت کتنی ہی پرانی ہوگئی ہو، اللہ تعالیٰ اسے ہر مرتبہ اتنا ہی ثواب بخشے گا جتنا مصیبت پیش آنے کے وقت بخش چکا ہے۔''[1]

غور کریں! حضرت حسین رضی اللہ عنہ خود یہ حدیث کس طرح روایت کر رہے ہیں، پھر ان سے ان کی صاحبزادی روایت کرتی ہیں، جو بذات خود کربلا میں موجود تھیں!

مصائب کے دنوں کو ماتم کے دن بنانا، مسلمانوں کا دین نہیں بلکہ جاہلیت کے دین سے زیادہ قریب ہے۔ پھر یہ بدعتیں ایجاد کر کے لوگوں نے اپنے آپ کو اس دن کے مشروع روزے کے ثواب سے بھی محروم کر لیا ہے۔

ایک طرف کچھ لوگوں نے یہ بدعتیں نکالی ہیں، دوسری طرف کچھ لوگوں نے ان کے مدّ مقابل دوسری بدعتیں ایجاد کر لی ہیں مثلاً نہاتے دھوتے ہیں، سرمہ لگاتے ہیں، مصافحے کرتے ہیں اور اہل و عیال پر پہلے سے زیادہ خرچ کرتے ہیں اور ان کاموں کو افضل سمجھتے ہیں۔ ان بدعتوں کے جواز میں متعدد حدیثیں بھی روایت کی جاتی ہیں مگر وہ تمام کی تمام موضوع ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء في الصبر على المصيبة، حديث:1600 و مسند أحمد: 27/4,201/1۔ اس کی سند میں ہشام بن زیاد ضعیف راوی ہے اور وہ اپنی ماں سے بیان کر رہا ہے اس کا حال معروف نہیں، لہٰذا یہ روایت کمزور ہے۔

ناصبیوں اور رافضیوں کی باہمی عداوت مشہور ہے۔ ناصبیوں نے دیکھا کہ رافضی یوم عاشورا میں ماتم کرتے ہیں تو انھوں نے ان کی ضد میں اس دن کو عید قرار دے دیا، حالانکہ دونوں کے اعمال یکساں طور پر بدعت اور باطل ہیں۔ دونوں میں بدعت اور گمراہی موجود ہے، اگرچہ شیعہ حضرات یعنی رافضی جھوٹ میں بڑھے ہوئے ہیں اور مجموعی طور پر ان کے اعمال زیادہ برے ہیں لیکن کسی کے لیے جائز نہیں کہ دشمنی یا ضد میں شریعت الٰہی کو بدل ڈالے۔ جس طرح رافضیوں کی بدعتیں مکروہ ہیں اسی طرح ناصبیوں کی بھی مکروہ ہیں۔ شیطان کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ مخلوق کو صراط مستقیم سے ہٹا دے۔ اگر اسے اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو پھر وہ پروا نہیں کرتا کہ کون سا شخص گمراہوں کی کس جماعت میں جاتا ہے۔

ماہ رجب

اسی قبیل سے ماہ رجب ہے۔ یہ حرمت والے مہینوں میں سے ایک ہے۔ نبی پاک ﷺ سے مروی ہے کہ جب رجب کا مہینہ آتا تو آپ دعا کرتے تھے کہ ''یا اللہ العالمین! ہمارے لیے رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما اور رمضان تک پہنچا۔''[1] اس کے علاوہ رجب کی فضیلت میں کوئی حدیث ثابت نہیں بلکہ جتنی روایات اس بارے میں بیان کی جاتی ہیں، تمام کی تمام جھوٹ ہیں۔

جس حدیث کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ جھوٹی ہے، اس کا فضائل میں روایت کرنا جائز

[1] مسند أحمد: 259/1، علامہ ہیثمی نے 140/3 مجمع الزوائد میں اسے بزار اور طبرانی کی الأوسط کی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز اسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تبیین العجب'' میں صفحہ: 39،37 پر ذکر کیا ہے۔ اس کی سند میں زائدہ بن ابی الرقاد متکلم فیہ راوی ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تقریب التھذیب: 307/1 میں اسے منکر الحدیث قرار دیا ہے۔

ہوسکتا ہے لیکن جب ثابت ہو جائے کہ جھوٹی ہے تو پھر کسی حال میں بھی اس کی روایت جائز نہیں، الّا یہ کہ ساتھ ہی اس کی حقیقت بھی بیان کر دی جائے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''جو کوئی مجھ سے حدیث روایت کرتا ہے اور وہ جان چکا ہوتا ہے کہ وہ جھوٹی ہے تو وہ خود بھی جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک ہے۔''[1]

شعبان کی پندرہویں رات

اسی قبیل سے شعبان کی پندرہویں رات ہے۔ متعدد احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات بہت فضیلت والی ہے۔ (مگر وہ ساری روایتیں ضعیف اور متکلم فیہ ہیں۔) سلف صالحین رحمہم اللہ میں سے بعض لوگ اسے نماز کے ساتھ مخصوص کرتے تھے جب کہ بہت سے علمائے سلف نے اس کی فضیلت سے انکار کیا ہے۔ بہر حال بہت سے اہلِ علم کا رجحان انھی ضعیف روایات کی بنیاد پر اس طرف ہے کہ وہ فضیلت رکھتی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی خیال ہے۔ البتہ اس دن کا خاص روزہ رکھنا شریعت میں کوئی اصل نہیں رکھتا بلکہ اکیلے اس روزے کو مکروہ کہا جائے گا۔ اسی طرح اس دن کو عید بنانا، اس میں طرح طرح کے کھانے پکانا اور آرائش کرنا بھی بدعت ہے۔ اسی طرح مسجدوں میں اس رات جمع ہونا، ایک خاص قسم کی نماز پڑھنا بھی بدعت ہے جسے ''صلاۃ الفیۃ'' کہتے ہیں۔ نفل نماز کے لیے وقت، تعداد اور مقدار کی تعیین کے ساتھ اجتماع کرنا مکروہ ہے اور شرعاً روا نہیں۔

تمام مسلمان مردوں کے لیے نماز جنازہ

اگر ہر رات کی علیحدہ علیحدہ فضیلت بیان کر کے اس کو کسی نماز کے ساتھ خاص کرنا جائز ہو

[1] صحیح مسلم، مقدمۃ الکتاب، باب وجوب الروایۃ من الثقات وترک الکاذبین......، حدیث:1

پھر تو عیدین کی راتوں اور عرفہ کی رات میں ان کی مثل یا اس سے کم وبیش نمازیں ایجاد کر لی جائیں۔ جس طرح کہ بعض مقامات پر رجب کی پہلی رات میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جاتی ہے، وہ بھی مکروہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض دیہاتوں میں نماز مغرب کے بعد لوگ ایک نماز پڑھتے ہیں اور اس کا ثواب والدین کو بخشتے ہیں۔ اس نماز کا نام ''صلوۃ برّ الوالدین'' رکھا گیا ہے، یا جیسا کہ بعض لوگ ہر رات دنیا کے تمام مرنے والے مسلمانوں کے لیے باجماعت نماز پڑھتے ہیں تو یہ اور اس قسم کی تمام باجماعت نمازیں بدعت ہیں اور ان سے اجتناب لازمی ہے۔ بلاشبہ معین اوقات میں نفل پڑھنا مستحب ہے۔ جماعت کے ساتھ بھی نفلی نماز پڑھنا جائز ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پابندی کے ساتھ نفل نمازیں مقرر کر لی جائیں اور انھیں فرض نمازوں کی طرح ہمیشہ پڑھا جائے۔

نفل نماز کے لیے اجتماع

یہ فرق ہمیشہ یاد رکھیں کہ نفل نماز پڑھنے، تلاوتِ قرآن کریم سننے اور ذکرِ الٰہی کرنے کے لیے کبھی کبھار اجتماع کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ نبیٔ کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے نفل نماز کبھی کبھی جماعت کے ساتھ پڑھی ہے۔[1] کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجلس میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے، سب سن رہے ہیں۔ آپ بھی آ بیٹھے اور سننے لگے۔[2] صحابہ کا

---

[1] صحیح البخاری، التهجد، باب ماجاء فی التطوع مثنٰی ، حدیث:1167,1164و باب صلاۃ النوافل جماعۃ، حدیث:1186و صحیح مسلم،المساجد، باب جواز الجماعۃ فی النافلۃ ....، حدیث:660,658

[2] سنن أبی داود، العلم، باب فی القصص، حدیث3666۔ اس کی سند میں معلّٰی بن زید راوی ہے جسے ابوحاتم، ابن حبان اور ابوبکر بزار نے ثقہ کہا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی روایات میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ صرف ابن معین کے اس کے متعلق دو مختلف قول ہیں۔ بہر حال جمہور علماء کے نزدیک اس کی روایات قابل حجت ہیں، لہٰذا یہ حسن روایت ہے۔

دستور تھا کہ جب کبھی جمع ہو جاتے تھے تو کسی ایک کو قرآن پڑھنے کے لیے کہتے تھے اور سب سنتے تھے۔ کتاب اللہ کی تدریس وتلاوت کرنے والوں اور ذکر الٰہی میں مشغول ہونے والوں کی فضیلت کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں اور مشہور ہیں۔ مثلاً نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''جو لوگ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر کتاب اللہ کی تلاوت وتدریس کرتے ہیں تو رحمت ان پر چھا جاتی ہے۔ سکینت نازل ہوتی ہے، فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنے حضور میں کرتا ہے۔''[1]

اجتماع کب جائز ہے؟

البتہ اس طرح کے کسی اجتماع کو باضابطہ مقرر کر لینا اور ہفتوں، مہینوں یا برسوں کی قید کے ساتھ انھیں معین اوقات میں منعقد کرنا مناسب نہیں، کیونکہ اس صورت میں وہ فرض نمازوں، جمعہ، عیدین اور حج کے اجتماعوں کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ پس اس فرق کو یاد رکھیں، کسی مباح بات کو ایک سنت وعادت قرار دے لینا روا نہیں لیکن اگر اسے سنت وعادت بنائے بغیر کبھی کبھار کیا جائے تو روا ہے۔

امام احمد اور دوسرے ائمہ کرام ؒ کی بھی یہی رائے ہے، چنانچہ ابوبکر ؒ نے ''کتاب الأدب'' میں اسحاق بن منصور ؒ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد ؒ سے دریافت کیا: ''کیا یہ مکروہ ہے کہ لوگ جمع ہوں اور ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''میرے خیال میں یہ مکروہ نہیں بشرطیکہ لوگ قصد وارادے کے ساتھ جمع نہ ہوں اور اسے عادت وسنت نہ بنالیں۔'' اسحاق بن راہویہ ؒ کا یہی

---

[1] صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذكر، حديث: 2699

قول ہے۔

امام مروزی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: ''کیا یہ درست ہے کہ لوگ پوری رات اس حال میں گزار دیں کہ کوئی قراءت کر رہا ہو اور باقی سنتے رہیں اور دعائیں کرتے رہیں، یہاں تک کہ صبح ہو جائے؟'' انھوں نے کہا: ''امید ہے کہ اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔'' ابوالسری رحمہ اللہ کی روایت ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا: ''اس سے بہتر کیا ہے کہ لوگ جمع ہوں، نماز پڑھیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد کریں، جیسا کہ انصار نے کیا تھا۔''

اس سے امام احمد رحمہ اللہ کی مراد وہ واقعہ ہے، جسے محمد بن سیرین رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ انصار نے نبی کریم ﷺ کے ہجرت کر کے مدینے میں تشریف لانے سے پہلے باہم مشورہ کیا کہ کیا اچھا ہو اگر ہم ایک دن مقرر کر کے جمع ہوا کریں، اور اللہ کی اس نعمت (اسلام) کا ذکر کیا کریں جو اس نے ہمیں بخشی ہے؟ بعض نے کہا کہ ہفتے کا دن بہتر ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا کہ یہ یہودیوں کا دن ہے اور ہم ان کی تقلید نہیں کریں گے۔ پھر اتوار کا دن کہا گیا مگر وہ عیسائیوں کا دن تھا۔ آخر جمعہ کے دن پر اتفاق ہوا۔ وہ حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں جمع ہوئے۔ ایک بکری ذبح کی گئی اور وہ سب کو کافی ہوگئی۔ [1]

طرطوسی کی روایت میں ہے کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا: ''اگر لوگ جمع ہوں۔ قاری غمناک آواز میں تلاوت کرے، وہ روئیں اور بسا اوقات چراغ بجھالیں، تو کیا یہ روا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا کہ ''اگر قاری، حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی سی قراءت کرے تو کوئی حرج نہیں۔''

---

[1] اسے امام احمد نے روایت کیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اپنی کس کتاب میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند منقطع ہے اور محمد بن سیرین نے اسے ''نُبِّئْتُ'' کے صیغے سے بیان کیا ہے یعنی مجھے خبر دی گئی۔ وہ خبر دینے والا کون تھا۔ اس کا علم چونکہ نہیں اس لیے پتہ چلا کہ یہ منقطع روایت ہے۔

خلال نے روایت کیا ہے کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: ان لوگوں کے بارے میں کیا رائے ہے جو جمع ہو کر ایک شخص سے کہتے ہیں کہ قصے سنائے؟ انھوں نے کہا: ''اگر کسی کسی دن ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' امام احمد رحمہ اللہ کی تصریحات سے ثابت ہو رہا ہے کہ دعا کے لیے اجتماع جائز ہے بشرطیکہ وہ سنت نہ بنالیا جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ اور آثار انبیاء علیہم السلام

امام احمد رحمہ اللہ کی یہی رائے ان مقامات کی زیارت کے متعلق بھی ہے جن میں انبیاء علیہم السلام کے آثار موجود ہیں۔ چنانچہ سندی الخواتیمی سے مروی ہے کہ ہم نے اس شخص کے بارے میں سوال کیا جو ان مقامات میں آیا جایا کرتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: ''حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ میرے گھر میں آکر نماز ادا کیجیے تاکہ میں اس جگہ کو مصلیٰ (جائے نماز) بنالوں۔[1] اس حدیث کی بنا پر کوئی حرج نہیں کہ آدمی ان مقامات میں جائے۔ لیکن لوگوں نے اس میں بہت زیادہ افراط کردی ہے۔''

احمد بن قاسم سے روایت ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو مدینہ یا دوسرے مقامات کے ان مشاہد میں جاتا ہے؟ تو انھوں نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا دستور تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گزرگاہوں اور مقامات کا تتبع کیا کرتے تھے۔[2] ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ آپ ایک جگہ پانی گرا رہے ہیں۔ پوچھا گیا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ کہنے لگے: اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں پانی گراتے دیکھا تھا۔ اس حدیث کے بموجب اس شخص

---

[1] صحيح البخاري، الصلاة، باب المساجد في البيوت، حديث: 425 وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعا، حديث: 33

[2] صحيح البخاري، الصلاة، باب المساجد التي على طرق المدينة، حديث: 484،483

کے فعل میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن لوگوں نے اس میں بہت غلو اور زیادتی کر دی ہے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد

اس طرح کی کراہت بہت سے علمائے سلف رحمہم اللہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں نے جب ذکر وعبادت کے لیے ایک جگہ مقرر کر لی اور وہاں جمع ہونے لگے تو ایک دن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آ کر انھیں سخت تنبیہ کی۔ فرمانے لگے: ''اے لوگو! کیا تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اصحاب (رضی اللہ عنہم) سے زیادہ ہدایت یافتہ ہو یا تم گمراہی کی راہ پر جا رہے ہو؟''[1]

اور اصل اس کی یہ ہے کہ وہ مشروع عبادتیں جو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہیں اور وہ اتنی ہیں کہ بندوں کے لیے کافی ہیں۔ پس جب بھی وقت کی تعیین کے ساتھ اجتماع ایجاد کیا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے اجتماعات کا مدمقابل بن جاتا ہے۔ اس فعل میں مضرتیں اور نقصانات ہیں، ان میں سے بعض کی طرف اشارہ گزر چکا ہے۔ لیکن اگر تنہا آدمی کوئی خاص عمل کرتا ہے یا کوئی جماعت کبھی کبھی کوئی بات کر لیتی ہے تو اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ایسی صورت میں وہ فعل سنت وشریعت نہیں بن سکتا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک

یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تنہا رجب کے مہینے کے روزے رکھنے کو ناپسند کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ درخت کٹوا ڈالا تھا جسے لوگ بیعت رضوان والا درخت سمجھنے لگے تھے اور اس کی زیارت کو مسجد حرام اور مسجد نبوی کی زیارت کی طرح آنے لگے

---

[1] اسے امام دارمی نے اپنی سنن کے مقدمے میں جید سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تھے۔[1] اسی طرح جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ عام طور پر اس مقام میں عبادت کو جانے لگے ہیں۔ جہاں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی تو انھیں منع کیا اور فرمایا: ''کیا تم اپنے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کو مسجدیں بنالینا چاہتے ہو؟''

کب حکم بدل جاتا ہے

اصول اس بارے میں یہ ہے کہ جس طرح نفل نماز، تنہا پڑھی جائے یا با جماعت ادا کی جائے، سب جائز ہے بشرطیکہ اسے اس طرح مقرر نہ کرلیا جائے کہ معین اوقات میں جمعہ، عیدین اور فرض نمازوں کی طرح ہوجائے۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ علیحدہ علیحدہ یا جماعت کے ساتھ تلاوت، ذکر یا دعا کی جائے نیز یہ بھی جائز ہے کہ بعض مشاہد میں بھی جایا جائے لیکن اس کا حکم اس وقت بدل جاتا ہے جب اس میں افراط کردی جاتی ہے اور اسے عادت وسنت بنالیا جاتا ہے۔ یہی حال تمام مشروع ومباح اعمال کا ہے۔ یہ اعمال اس وقت بدعت ہوجاتے ہیں جب انھیں اس طرح ایک ضروری عادت قرار دے لیا جائے کہ وہ واجب کے درجے پر سمجھے جانے لگیں۔

یہ مسائل اوران کی جزئیات زیادہ تفصیل طلب ہیں مگر یہاں اتنا بیان ہی کافی ہے۔ مقصود صرف مبتدعہ مواسم (بدعتی مواقع) کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ رہ گئے وہ اعمال جو عیدوں میں

---

[1] یہ قصہ ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے دیکھیے: مصنف ابن ابی شیبہ: 2/73/2۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں لیکن نافع اور عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان ''ابن عمر رضی اللہ عنہما'' کا واسطہ ہو لیکن پھر بھی یہ بخاری شریف کی اس روایت کے معارض ہے جسے نافع رحمہ اللہ نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ ''جب ہم اگلے سال واپس آئے تو ہم میں سے کسی بھی دو شخصوں کا بیعت رضوان والے درخت کی تعیین میں اتفاق نہ ہوسکا۔ دیکھیے: صحیح البخاري، الجهاد، باب البيعة في الحرب......، حدیث: 2958

کیے جاتے ہیں اور جو شرعاً ممنوع ہیں ان کی اجازت کسی صورت نہیں دی جاسکتی۔ مثلاً مسجدوں میں شور وغل، مردوں اور عورتوں کا باہم اختلاط، ضرورت سے زیادہ روشنی کرنا، نمازیوں کو تکلیف دینا وغیرہ۔ اس قسم کے اعمال کا حکم ہر مسلمان کو معلوم ہے۔

فضیلت والے دنوں میں بدعتیں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بدعتی لوگ فضیلت والے دنوں میں زمانی عید کے ساتھ ساتھ مکانی عید بھی ایجاد کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں قباحت اور بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے اور شریعت سے خروج کا معاملہ پیش آ جاتا ہے۔

یومِ عرفہ میں جو کچھ کیا جاتا ہے، وہ اس کی مثال ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس چیز کے ممنوع ہونے میں کسی مسلمان نے بھی اختلاف کیا ہو لیکن اس کے باوجود بدعتی ان افعال سے باز نہیں آتے۔ اس دن میں ان کے افعال یہ ہیں، کسی بزرگ کی قبر پر جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں اور ٹھیک وہی انداز اختیار کر لیتے ہیں جو عرفات میں حاجیوں کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ فعل ایک خود ساختہ حج ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔ یہ آدمیوں کا مقرر کیا ہوا حج، اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حج کے مد مقابل بنا دیا جاتا ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ قبروں پر کیے جانے والے ان افعال کو بالکل عید سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح بیت المقدس کا سفر اس نیت سے کرنا کہ وہاں اس طرح رہیں گے جس طرح حاجی عرفات میں رہتے ہیں، صریح گمراہی ہے۔ بلاشبہ بیت المقدس کی زیارت مستحب ہے مگر صرف اس لیے کہ اس میں نماز پڑھی جائے اور اعتکاف کیا جائے۔ بیت المقدس ان تین مسجدوں میں سے ایک ہے جس کے لیے شدّ رحال (تبرک کے لیے سواری تیار کرنا اور پھر

ادھر کا رخ کرنا) جائز اور روا ہے۔ لیکن خاص طور پر ایامِ حج میں وہاں جانا مکروہ ہے۔ کیونکہ بیت المقدس کی زیارت کے لیے لوگوں نے ایک وقت خاص مقرر کر لیا ہے، حالانکہ اس وقت خاص میں اس کی زیارت کوئی خصوصیت نہیں رکھتی۔ پھر ایسا کرنے سے حج کا مقابلہ پیش آ جاتا ہے۔ بیت المقدس کی کعبہ سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس فعل سے ان اعمال تک نوبت پہنچتی ہے کہ جو مسلمان بھی ان کو دیکھے گا وہ بغیر کسی شک کے کہہ دے گا کہ یہ اسلام نہیں بلکہ کوئی دوسری شریعت ہے۔ اور وہ اعمال یہ ہیں کہ لوگ صخرے کا طواف کرتے ہیں، وہاں سر منڈاتے ہیں اور قربانیاں کرتے ہیں، اسی طرح عرفات میں گمراہوں کا جبلِ رحمت میں موجود قُبّے کا طواف کرنا بھی ناروا ہے۔

عیدوں میں باجے

اسی طرح عیدوں پر باجے بجانا، نغمے گانا، مسجد اقصیٰ میں دف بجانا اور ریشمی کپڑے پہننا وغیرہ بھی مکروہ ہے۔ صرف عید ہی میں نہیں، بلکہ دوسرے دنوں میں بھی یہ باتیں ناروا ہیں اور یہ کام کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر بھی بہت قبیح اور بُرے ہیں مثلاً یہ کام مسجد اقصیٰ میں کرنا حالانکہ یہ کام تمام مساجد کے باہر بھی ممنوع ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں باطل کاموں کو دین بنانے کا ارتکاب کیا گیا ہے اور پھر عید کے دنوں میں ایسا کیا جاتا ہے۔ سنت کا ترک بھی ویسے ہی بُرا ہے جیسے بدعت کا عمل۔ لہٰذا عیدیں اسی طرح منانی چاہئیں جس طرح سابقین اولین مناتے تھے۔ نماز ادا کرنی چاہیے، مشروع خطبہ سننا چاہیے، تکبیرات کو کثرت سے کہنا چاہیے، عید الفطر سے قبل صدقہ دینا چاہیے، عید الاضحیٰ میں قربانی کرنی چاہیے، لیکن لوگ ان مشروع اعمال میں خصوصاً تکبیرات کہنے میں سستی کرتے ہیں۔ اس طرح بعض امام ایسے ہیں کہ مردوں کو خطبہ سنانے کے بعد عورتوں کو خطبہ نہیں سناتے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا دستور

17723

تھا۔[1] بہت سے امام ایسے ہیں کہ عیدگاہ میں کبھی بھی قربانی نہیں کرتے، حالانکہ یہ بھی مسنون ہے۔ دین یہی ہے کہ معروف پر عمل کیا جائے اور اس کا حکم دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ منکر کو ترک کیا جائے اور اس سے منع کیا جائے۔

① صحیح البخاری، العلم، باب عظة الإمام النساء وتعلیمهن، حدیث:98و سنن أبی داود، الصلاة، باب الخطبة یوم العید، حدیث: 1140
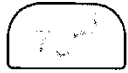
مکانی عیدیں

زمانی عیدوں کی طرح مکانی عیدوں کی بھی تین قسمیں ہیں:

① وہ جگہ جسے شریعت کی نظر میں کوئی خصوصیت حاصل نہیں۔

② وہ جگہ جسے خصوصیت تو حاصل ہے مگر اس خصوصیت کی وجہ سے عبادت کے لیے وہاں جانا ضروری نہیں۔

③ وہ جگہ جہاں عبادت مشروع ہے، لیکن اسے مزار (عید) بنالینا درست نہیں۔

تینوں قسموں کے بارے میں یہ احادیث وآثار وارد ہوئے ہیں مثلاً ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ وہ ''بوانہ'' میں جا کر جانور ذبح کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''وہاں مشرکین کا کوئی بت ہے یا ان کا کوئی مزار؟'' اس نے عرض کیا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: ''تو اپنی نذر پوری کر۔''[1] یا نبی کریم ﷺ کا فرمانا کہ ''میری قبر کو مزار (عید) نہ بنا لینا۔''[2] یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا منع کرنا کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار کو مزار نہ بنایا جائے۔[3] جیسا کہ ہم آئندہ

---

① سنن أبي داود، الأيمان والنذور، باب ما يؤمر به من وفاء النذر، حديث: 3313۔ اس کی سند صحیح ہے۔

② سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث: 2042 و مسند أحمد: 367/2۔ اس کی سند صحیح ہے۔

③ اس قول کو ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے اور اس کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔ دیکھیے: مصنف ابن ابی شیبہ: 1/84/2۔ تحذير الساجد: ص: 137 و فتح الباری: 569/1

بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ

پہلی قسم اس جگہ کی ہے جسے شریعت نے کوئی فضیلت نہیں دی اور نہ اس میں کوئی ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس میں کوئی فضیلت مانی جائے بلکہ باقی تمام جگہوں کی طرح ایک معمولی جگہ ہے یا ان سے بھی کم تر ہے۔ ایسی جگہ تعظیم کے خیال سے جانا یا نماز، دعا اور ذکر کے لیے اس جگہ جمع ہونا کھلی گمراہی ہے۔ پھر اگر اس جگہ یہود ونصاریٰ وغیرہ کفار کے آثار موجود ہیں تو اس جگہ کا قصد کرنا اور بھی زیادہ بُرا ہے کیونکہ یہ بتوں کی عبادت کے مشابہ ہے، اس کا ذریعہ ہے، یا اس کی ایک قسم ہے۔ بتوں کے پجاری بھی ایسا ہی کرتے تھے، کسی خاص جگہ بت کی موجودگی یا کسی تعظیم کے خیال سے جاتے اور سمجھتے تھے کہ ایسا کرنے سے قُربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

عرب کے بڑے بت

عرب میں سب سے بڑے بت تین تھے۔ لات، عزّیٰ اور منات۔ ان میں سے ہر بت کسی ایک بڑے شہر کے لیے مخصوص تھا۔ اس وقت حجاز میں بڑے شہر تین تھے۔ مکہ، مدینہ اور طائف۔

لات، طائف والوں کا بت تھا۔[1] اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ دراصل ایک پرہیز گار آدمی تھا اور حاجیوں کے لیے ستو بنایا کرتا تھا۔[2] جب مرا تو لوگوں نے اس کی قبر کی تعظیم وتکریم شروع کی، پھر اس کا بت بنالیا اور اس پر ایک عمارت کھڑی کردی جس کا نام ''بیت الرَّبة'' تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے بعد 9 ہجری میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ

---

[1] فتح الباری: 778/8

[2] صحیح البخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ النجم، باب ﴿أفرأيتم اللّات و العزّى﴾ حدیث: 4859

کو بھیج کر اسے تڑوا ڈالا۔[1]

عزّیٰ مکہ والوں کا بت تھا جو عرفات کے قریب موجود تھا۔ وہاں ایک درخت تھا جس کے نیچے بھینٹ چڑھاتے اور دعائیں کرتے تھے۔ فتح مکہ کے بعد نبیٔ کریم ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اسے بھی برباد کروا ڈالا۔[2] اور وہاں جو کچھ مال و متاع جمع تھا، سب کا سب تقسیم کر دیا۔ بت کے اندر سے ایک چڑیل بال کھولے نکلی تھی۔ (شاید کوئی دغا باز مجاورہ ہوگی جو لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے بت کے اندر رہتی ہوگی۔) اس وقت عزّیٰ کی پوجا سے ناامید ہوگئی ہوگی۔[3] مناۃ، مدینے کے باشندوں کا بت تھا۔ یہ ''قدید'' پہاڑ کے دامن میں قائم تھا جو ساحل کی سمت مکہ اور مدینہ کے مابین واقع ہے۔[4]

جو کوئی مشرکین عرب کے حالات اور شرک کی حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہے، جسکی اللہ تعالیٰ نے مذمت کی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اور اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ناپسندیدہ اعمال سے واقف ہو جائے، تو اسے نبیٔ کریم ﷺ کی سیرت اور آپ کے ہم عصر مشرکین عرب کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ارزقی نے ''اخبار مکہ'' میں اور دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں اس کے متعلق کافی مواد جمع کر دیا ہے۔

ذاتِ انواط

مشرکین ایک درخت کی بھی تعظیم کرتے اور اس پر اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، اس کا نام ''ذاتِ انواط'' تھا۔ بعض مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے لیے بھی ایک

---

① فتح الباری: 778/8 و فتح القدیر: 130,129/5

② فتح الباری: 778/8 و فتح القدیر: 130,129/5

③ فتح القدیر: 130/5

④ فتح الباری: 778/8 و فتح القدیر: 130/5

"ذاتِ انواط" مقرر کر دیجیے جیسا کہ ان لوگوں کا ذاتِ انواط ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "اللہ اکبر! تم نے وہی بات کہی ہے جو یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی کہ ﴿ اِجْعَل لَّنَآ إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ﴾ "یعنی اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہمارے لیے بھی ایک معبود مقرر کر دے جس طرح ان کے لیے معبود ہیں۔"[1] یہ گمراہی کے راستے ہیں اور تم پہلے گزر جانے والوں کی گمراہی کے راستوں کی پیروی کرو گے۔[2]

ملاحظہ کیجیے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے یہ بات محض اس وجہ سے ناپسند فرمائی کہ یہ مشرکین سے مشابہت رکھتی تھی حالانکہ چند ایک مسلمانوں نے اتنی سی بات چاہی تھی کہ مشرکین کی طرح ان کے لیے بھی ایک درخت خاص کر دیا جائے جہاں وہ ہتھیار لٹکایا کریں، مگر آپ نے اسے بھی منظور نہ کیا۔ ظاہر ہے جس بات میں مشرکین کی پوری مشابہت ہے یا جو شرک ہی کی قسم ہے، تو اس کا حکم کیا ہوگا؟

پس جو کوئی کسی خاص جگہ اس عقیدے سے جاتا ہے کہ وہاں جانے سے ثواب حاصل ہوگا، حالانکہ شریعت نے وہاں جانے میں کوئی ثواب تسلیم نہیں کیا تو اس کا یہ فعل بدعت و منکر ہے، اس کے بھی درجے ہیں۔ بعض زیادہ سخت برائی کے درجے ہیں اور بعض کم برائی کے، مگر یہ سب برائی ہی کی باتیں ہیں، چاہے وہ جگہ کوئی پہاڑ ہو یا غار، دریا ہو یا درخت، کچھ بھی ہو، سب کا حکم ایک ہی ہے۔

روشنی کرنا اور منت ماننا

آدمی خواہ کسی بھی عمل کی نیت سے وہاں جاتا ہے، عبادت کے لیے، نماز کے لیے، دعا کے

[1] الأعراف 138:7

[2] جامع الترمذی، الفتن، باب ماجاء لترکبنّ سنن من کان قبلکم، حدیث: 2180 ومسند أحمد: 218/5۔ اس کی سند صحیح ہے۔

لیے، تلاوت کے لیے، ذکرِ الٰہی کے لیے، یا کسی اور دینی عمل کے لیے، یہ تمام کا تمام ناروا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑی برائی یہ ہے کہ اس خاص جگہ روشنی کرنے کے لیے تیل لے جانے کی منت ماننے اور یقین کرے کہ ایسا کرنے سے مراد اور مقصد پورا ہو جاتا ہے، جیسا کہ بہت سے گمراہوں کو یقین ہے، تو اس کے متعلق بالاتفاق تمام علماء کا فیصلہ ہے کہ یہ نذر نافرمانی کی نذر ہے اور ہرگز پوری نہیں کرنی چاہیے۔ اسی طرح کسی خاص دریا یا کنوئیں کی مچھلیوں کو روٹی کھلانے کی منت ماننا، یا اس جگہ کے مجاوروں کو کچھ نقدی وغیرہ دینے کی منت ماننا بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ یہ مجاور ان لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں جو لات، عزیٰ اور منات کے مندروں میں رہتے تھے اور لوگوں کا مال حرام طریقے سے کھاتے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی راہ سے باز رکھتے تھے۔ یہ مجاور بتوں کے ان پجاریوں سے مشابہ ہیں جن سے امام الموحدین حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿مَا هَٰذِهِ ٱلتَّمَاثِيلُ ٱلَّتِيٓ أَنتُمْ لَهَا عَٰكِفُونَ ﴿٥٢﴾﴾

"یہ مورتیاں جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو، کیا ہیں؟"[1]

﴿أَفَرَءَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ﴿٧٥﴾ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُمُ ٱلْأَقْدَمُونَ ﴿٧٦﴾ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيٓ إِلَّا رَبَّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٧٧﴾﴾

"کچھ ان کی خبر بھی ہے جن کی تم اور تمھارے اگلے باپ دادا پوجا کرتے رہے، وہ سب میرے دشمن ہیں، بجز سچے اللہ تعالیٰ کے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔"[2]

پس ان مقامات کے مجاوروں کو کچھ دینے کی منت ماننا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔ یہ ویسی ہی منت ہے، جیسی کفار اور بت پرست، صلیب اور ہندوستان کے بت خانوں کے مجاوروں کی نسبت مانتے ہیں۔ یہ منت پوری کرنا ناروا ہے۔ منت کا جمع شدہ سرمایہ صرف

---

[1] الأنبياء 52:21 [2] الشعراء 26:75-77

شریعت کے بتائے ہوئے نیک کاموں، مثلاً مسجدوں کی تعمیر، یا نیک غریب مسلمانوں پر خرچ کردیا جائے تو بہتر ہے۔

ایسے مقامات میں ایسی جگہیں بھی ہیں جہاں کسی نبی یا صالح آدمی کی قبر سمجھی جاتی ہے یا یقین کیا جاتا ہے کہ اس نے وہاں قیام کیا تھا، حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوا ہوتا، اور اگر واقعی وہاں اس کی قبر یا مقام ہو تو پھر وہ جگہ دوسری قسم میں داخل ہوجاتی ہے۔

بزرگوں کی جعلی قبریں

بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں بزرگوں کی قبریں بتائی جاتی ہیں، حالانکہ وہاں ان کی قبریں نہیں ہیں۔ مثلاً دمشق میں مشرقی پھاٹک کے باہر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قبر بتائی جاتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ جملہ اہلِ علم متفق ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ دمشق میں نہیں بلکہ مدینہ میں فوت ہوئے ہیں۔ اللہ ہی جانے کہ وہ قبر کس کی ہے؟ بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قبر نہیں ہے۔

اسی طرح جامع مسجد دمشق کی ایک دیوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں حضرت ہود علیہ السلام کی قبر ہے حالانکہ کسی اہلِ علم نے یہ بیان نہیں کیا کہ پیغمبر ہود علیہ السلام کا دمشق میں انتقال ہوا تھا۔ ہاں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یمن میں فوت ہوئے تھے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ مکہ میں دفن ہیں جہاں وہ اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد ہجرت کرکے آئے تھے لیکن ملک شام کا ان سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، رہائش کا نہ ہجرت کا۔

اسی طرح دمشق کے مغربی پھاٹک کے باہر ایک قبر کو اویس قرنی رحمہ اللہ کی قبر قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ کسی نے بھی نہیں کہا کہ اویس قرنی رحمہ اللہ کی وفات دمشق میں ہوئی۔ دمشق تو دور کی بات ہے سرے سے ملک شام میں ان کا آنا بھی کسی نے بیان نہیں کیا۔

وہ یمن سے آئے اور عراق چلے گئے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ جنگ صفین میں قتل ہو گئے۔ بعض نے ان کی وفات، اطراف ایران میں لکھی ہے۔ اور بھی اقوال ہیں مگر شام میں ان کا آنا کسی نے بیان نہیں کیا۔

اسی طرح ایک قبر کو ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی قبر سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ کبھی شام میں نہیں آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد انھوں نے کوئی بھی سفر نہیں کیا، بلکہ مدینہ ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر

اسی طرح قاہرہ میں ایک مزار ہے جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مدفون بتایا جاتا ہے، حالانکہ جملہ اہلِ علم کے نزدیک یہ غلط ہے۔ اس قصے کی جھوٹی اصل اور بنیاد یہ ہے کہ عسقلان میں ایک مقام تھا جس کی بابت کہا جاتا تھا کہ اس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر دفن ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پھر بعد میں اسے عسقلان سے قاہرہ لا کر دفن کیا گیا۔ یہ قصہ بالکل غلط ہے کیونکہ اس کے متعلق کئی ایک اقوال ہیں اور یہ قول ان میں سے نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر کوفہ میں عبیداللہ بن زیاد کے پاس لایا گیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ یزید کے پاس شام میں لایا گیا تھا، مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس واقعہ میں جن صحابہ کا ذکر آتا ہے، وہ عراق میں تھے نہ کہ شام میں۔

اسی طرح بہت سی قبریں ایسی ہیں جنھیں مشہور آدمیوں کی قبریں سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ ان کی قبریں نہیں ہیں۔ پس ایسے مقامات میں ہرگز کوئی فضیلت نہیں اگرچہ جاہل ان کی فضیلت کے کتنے ہی قائل ہوں اور اگر واقعی وہاں بزرگوں کی قبریں ہوں تب بھی وہ افعال واقوال جائز نہیں ہو سکتے جن کو ان جھوٹی قبروں پر کیا جاتا ہے۔

قدمِ رسول ﷺ

اسی باب میں وہ مقامات بھی داخل ہیں جہاں نبی ﷺ کے نقشِ قدم یا دوسرے آثار بیان کیے جاتے ہیں جن کو مکے میں موجود مقام ابراہیم کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیت المقدس میں صخرے پر ایک نقش ہے، جاہل سمجھتے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا نقشِ قدم ہے بلکہ میں نے سنا ہے کہ بہت سے احمق اسے خود اللہ تعالیٰ کا نقشِ قدم سمجھتے ہیں۔

اسی طرح دمشق میں ایک مسجد کا نام مسجد قدم ہے۔ اس میں ایک نقش ہے جسے موسیٰ علیہ السلام کا نقشِ قدم بتایا جاتا ہے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دمشق بلکہ اس کے اطراف میں بھی کبھی نہیں پہنچے۔

ولی کو خواب میں دیکھنا

اسی طرح بہت سے مقامات ایسے ہیں جنھیں انبیاء علیہم السلام یا صالحین رحمۃ اللہ علیہم سے نسبت دے دی گئی ہے اور صرف اس بنا پر کہ کسی نے دعویٰ کر دیا ہے کہ میں نے فلاں نبی یا بزرگ کو اس جگہ خواب میں دیکھا ہے۔ حالانکہ نبی یا ولی کو کسی مقام پر خواب میں دیکھ لینے سے باتفاق جملہ اہلِ اسلام، اس مقام کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی کہ اس وجہ سے اس کی زیارت کی جائے اور اسے عبادت گاہ قرار دیا جائے۔ اس طرح کے افعال اہلِ کتاب کیا کرتے ہیں۔ انھی کی دیکھا دیکھی بہت سے جاہل مسلمان بھی ایسا کرنے لگے ہیں، حتیٰ کہ ان کی تقلید میں نبی یا ولی کی تصویر بھی بنانے لگے ہیں۔ چنانچہ دمشق میں ایک مسجد تھی جس کا نام ''مسجدِ کف'' تھا اس میں ایک ہتھیلی کی صورت موجود تھی اور اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہتھیلی کہا جاتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بت کو ختم کر ڈالا۔

اسی طرح کے مقامات بہت سے ملکوں حتیٰ کہ حجاز میں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ بدر سے مکہ آتے ہوئے راستے میں داہنی طرف ایک غار دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بابت مشہور کر دیا گیا ہے کہ یہ وہی غار ہے جس میں ہجرت کے موقع پر رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پناہ لی تھی۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ وہ غار جبلِ ثور میں موجود ہے جو مکہ کے قریب واقع ہے اور تمام اہلِ مکہ اس سے اب تک واقف ہیں۔

محسوسات کی تعظیم

بہر حال یہ مقامات ہوں یا دوسرے ایسے مقامات جنھیں شریعت نے کوئی فضیلت نہیں دی، ان کی تعظیم نہیں کرنی چاہیے۔ مقام کی تعظیم زمانے کی تعظیم سے کہیں زیادہ بری ہے کیونکہ محسوسات کی تعظیم، غیر محسوسات کی تعظیم سے زیادہ بتوں کی عبادت سے قریب ہے۔ شریعت نے اس کے متعلق خاص اہتمام کرتے ہوئے جس بات سے بھی شرک کا احتمال ہو سکتا تھا، منع کر دیا ہے۔ چنانچہ قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی اگرچہ نماز پڑھنے والے کا ارادہ قبر کی تعظیم نہ بھی ہو اور یہ محض اس لیے ہے کہ کہیں یہ فعل قبروں کی تعظیم و عبادت کا ذریعہ اور سبب نہ بن جائے۔

بدعیہ مقامات اور مسجد ضرار

درحقیقت یہ مقامات اس مسجد ضرار سے مشابہ ہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَم مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَـٰنَهُۥ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَٱنْهَارَ بِهِۦ فِى نَارِ جَهَنَّمَ ۗ﴾

”یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد (دریا کے) ایک کھوکھلے گرنے والے کنارے پر رکھی؟ پھر وہ اسے جہنم کی آگ میں لے گرا۔“[1]

---

[1] التوبۃ 109:9

یعنی اس کی بنیاد گر جانے والے کنارے پر رکھی گئی تھی اور جو پوری عمارت کو لے کر دوزخ میں جا گری۔ یہ مسجد جب بنائی گئی تو ﴿ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ﴾[1] ضد، کفر، مسلمانوں میں تفریق اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کی تائید کے خیال سے بنائی گئی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس میں نماز پڑھنے سے منع کیا اور اس کو گرا دینے کی تاکید فرمائی۔

یہ باطل مشاہد و مزارات بھی اس لیے بنائے گئے ہیں کہ یہ اللہ کے گھروں کے مدمقابل کھڑے ہوں اور جسے اللہ تعالیٰ نے تعظیم نہیں بخشی، اس کی تعظیم کرائی جائے۔ جو چیزیں نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان، ان کے آگے مخلوق کا سر جھکایا جائے اور بندوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھا جائے۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کی راہ صرف یہ ہے کہ اس وحدہٗ لاشریک کی اسی طرح عبادت کی جائے جیسے خود اس نے اپنے رسول ﷺ کی زبان سے مقرر کر دی ہے نیز یہ بھی غرض ہے کہ یہ مقامات غیر شرعی عیدیں بن جائیں کیونکہ عید کے معنی ہیں بار بار لوٹنا، چونکہ لوگ بار بار ان کی زیارت کو آتے ہیں اس لیے وہ عیدیں ہیں۔

سچی قبریں

اکثر قبریں جو بزرگوں کی سمجھی جاتی ہیں ان کی نہیں ہیں اور سچی قبریں بہت کم ہیں۔ بہت سے علماء کو تو یہاں تک خیال ہے کہ ہمارے نبیٔ معظم ﷺ کی قبر کے سوا کسی پیغمبر کی بھی قبر موجود نہیں۔ بعض نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر کو بھی صحیح قرار دیا ہے مگر اس کے ایک جانب میں ہونا معلوم ہے، تعیین کا علم نہیں۔ جیسے کہ بعض مقامات کی نسبت معلوم ہے کہ وہاں کس طرف فلاں بزرگ مدفون ہے مگر خود قبر کا صحیح پتہ نہیں ملتا۔ مثلاً معلوم ہے کہ دمشق کے

---

[1] التوبة 9:107

باب الصغیر میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبریں ہیں مگر چونکہ وہاں زمین بار بار کھودی اور الٹ پلٹ کی جا چکی ہے اس لیے کسی قبر کا تعین نہیں کیا جا سکتا، اِلاّ یہ کہ کسی معتبر ذریعہ سے کسی قبر کی تحقیق ہو جائے اور اگر یہ تحقیق ہو جائے تو بھی وہاں وہ اعمال جائز نہیں ہو سکتے جو بدعت کی راہ سے لوگ کیا کرتے ہیں۔

بغیر علم کے عمل

بغیر علم کے عمل وعبادت اسی طرح ممنوع ہے جس طرح علم کے خلاف عمل وعبادت ممنوع ہے۔[1] اگر قبروں وغیرہ کی تعظیم شرعاً مقصود ہوتی تو اس کا علم مفقود نہ ہوتا بلکہ اسے محفوظ رکھا جاتا اور اس امت میں، جو خطا سے معصوم ہے اور جس کا دین محفوظ کر دیا گیا ہے، اس کا علم برابر باقی رہتا۔

ان قبور ومقامات کی بزرگی کے افسانے عموماً ان کے مجاوروں سے مشہور ہوتے ہیں کیونکہ یہی دجل وفریب اور دھوکہ ان کے رزق کا ذریعہ ہے۔ وہ حرام طریقے سے لوگوں کا مال کھاتے ہیں اور بندوں کو اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں، چنانچہ جاہل لوگوں سے کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے اس کے سامنے دعا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کر لی تھی، اس نے کسی بات کے لیے یہاں منت مانی تھی اور اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی۔ بتوں کی پرستش کا بھی ایسے ہی جھوٹے افسانوں سے رواج ہوا تھا۔ ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں میں لوگ بتوں کے پاس مرادیں لے کر جاتے ہیں اتفاق سے بعض لوگوں کے کام ہو بھی جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ بت کی کرامت سے ہوئے ہیں۔ اسی قسم کے شبہات سے دنیا میں شرک پھیلا ہے۔

---

[1] یہاں علم وعمل سے مراد شرعی علم وعمل ہے۔

منت یا نذر

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے نذر اور منت سے منع کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:
''منت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ اس ذریعے سے بخیل کا مال خرچ کراتا ہے۔''[1]
پس اگر اطاعات میں نذر ومنت سے کوئی فائدہ نہیں، تو سمجھ لو کہ ان قبروں وغیرہ کی منت ماننے سے کیا حاصل ہوسکتا ہے؟ جو نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان۔

قبولیتِ دعا کے اسباب

دعا کے مقبول ہونے کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ کبھی دعا کرنے والے کی بے چینی و بے قراری اور دل کی سچائی اس کا سبب بن جاتی ہے۔ کبھی محض اللہ کی رحمت باعث ہوا کرتی ہے۔ کبھی کوئی حاجت اس لیے پوری ہوجاتی ہے کہ پہلے ہی سے مقدر ہوچکی ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بعض اسباب دعا کرنے والے کے حق میں کبھی فتنہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کفار کی بھی بہت سی دعائیں قبول ہوجاتی ہیں، چنانچہ پانی برس جاتا ہے، فتح حاصل ہوجاتی ہے، صحت مل جاتی ہے، روزی مل جاتی ہے حالانکہ وہ بتوں کے سامنے اور ان کے توسل سے دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هَٰٓؤُلَآءِ وَهَٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝٢٠ ﴾

''ہر ایک کو، ان کو بھی اور اُن کو بھی ہم تیرے پروردگار کے انعامات میں سے پہنچائے جاتے ہیں۔ تیرے پروردگار کی بخشش رکی ہوئی نہیں ہے۔''[2]

---

[1] صحیح البخاری، الأیمان والنذور، باب الوفاء بالنذر، حدیث: 6693,6692 و صحیح مسلم، النذر، باب النھی عن النذر، حدیث: 1639۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔

[2] الإسراء 20:17

یہ مسئلہ بہت تفصیل طلب ہے۔ اسباب کا بیان شرح وبسط کا محتاج ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔ ان شاء اللہ میں کسی دوسری جگہ اس پر بحث کروں گا، لیکن آدمی پر جو کچھ فرض ہے وہ یہی ہے کہ اسی ہدایت پر عمل کرے جسے دے کر اللہ نے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا اور ہر شخص یہ یقین رکھے کہ دنیا وآخرت کی بھلائی اسی میں ہے۔

فصل 8

مزار نہ بناؤ

دوسری قسم ان جگہوں کی ہے جنھیں خصوصیت حاصل ہے لیکن اس خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ انھیں مزار اور عید بنایا جائے، یا وہاں نماز پڑھی جائے، یا دوسری عبادتیں کی جائیں۔ اس قسم میں وہ جگہیں داخل ہیں جہاں انبیاء وصالحین کی قبریں واقع ہیں اور نبیٔ کریم ﷺ اور سلف صالحین سے ان کو مزار اور عبادت گاہ بنانے کی ممانعت آئی ہے، عموم کے ساتھ بھی اور خصوص کے ساتھ بھی، نیز عید کے معنی بھی خود انھی نے بیان کر دیے ہیں۔

قبر نبوی پر درود وسلام

امام ابوداود نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اپنے گھروں کو قبریں مت بناؤ اور میری قبر کو عید (مزار) نہ بنانا بلکہ مجھ پر درود بھیجو، یقیناً تم کہیں بھی ہو تمھارا درود مجھے پہنچ جائے گا۔''[1]

بعض لوگوں نے اس حدیث کے ایک راوی عبداللہ بن نافع کے حفظ میں کلام کیا ہے، مگر حدیث کی صحت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس کی تائید میں اور احادیث بھی موجود ہیں، مثلاً ابو یعلی موصلی رحمہ اللہ نے اپنی مسند میں حضرت زین العابدین علی بن حسین رحمہ اللہ سے

[1] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 و مسند أحمد:367/2۔ اس کی سند صحیح ہے۔

روایت کیا ہے کہ انھوں نے ایک شخص کو اس جگہ جاتے اور دعا کرتے دیکھا جو قبر نبوی کے پاس کھلی تھی۔ آپ نے اسے منع کیا اور لوگوں سے فرمایا: کیا میں تمھیں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث نہ سناؤں جو مجھے اپنے والد اور دادا کے ذریعے سے پہنچی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری قبر کو عید نہ بنانا اور اپنے گھروں کو قبریں نہ قرار دے لینا۔ تم کہیں بھی ہو تمھارا سلام مجھے پہنچ جائے گا۔''[1]

سہیل بن ابی سہیل رحمہ اللہ کی حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پوتے حسن بن حسن رحمہ اللہ نے مجھے قبر نبوی کے پاس دیکھا۔ وہ اس وقت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں کھانا کھا رہے تھے انھوں نے مجھے آواز دی کہ آؤ کھانا کھالو۔ میں نے انکار کیا تو انھوں نے تعجب سے کہا: یہ کیا بات ہے کہ تم قبر نبوی کے پاس موجود تھے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں! رسول اللہ ﷺ کو سلام کرنے گیا تھا۔ انھوں نے کہا: تمھیں چاہیے کہ جب مسجد میں داخل ہو تو سلام کرلیا کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''میرے گھر کو عید نہ بناؤ اور اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ بلکہ مجھ پر درود بھیجو، تمھارا درود مجھے پہنچ جائے گا اگرچہ تم کتنے ہی دور ہو، یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جنھوں نے اپنے انبیاء کی قبریں مسجد بنالی ہیں تم اور اندلس والے سب برابر ہو۔ (ہر جگہ سے درود پہنچ جائے گا۔)''[2] غور کرنا چاہیے نبی ﷺ کی قبر تمام

---

[1] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 ومسند أحمد:367/2۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مصنف ابن أبي شيبه،الصلاة، باب في الصلاة عند قبر النبي ﷺ وإتيانه، حديث:7541: 152/2 وصحيح ابن خزيمه:48/4۔ ابن عساكر:4/217/1۔ المصنف لعبد الرزاق: 6694/577/3۔ یہ روایت مرسل ہے اور اس کی سند میں سہیل بن ابی سہیل مجہول راوی ہے، البتہ اس کے صحیح شواہد موجود ہیں مثلاً دیکھیے: سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 و مسند أحمد:367/2

روئے زمین پر سب سے زیادہ فضیلت وشان والی قبر ہے لیکن اس کے باوجود خود آپ ہی نے اسے عید بنانے کی ممانعت کر دی۔ ظاہر ہے آپ کے سوا اور تمام لوگوں کی قبریں، اگر چہ وہ کوئی ہوں، بدرجہ اولیٰ ممانعت کی مستحق ہیں، نیز ان حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی قبر کی بابت ممانعت کے ساتھ اس سے منع کر دیا ہے کہ لوگ اپنے گھروں کو قبریں بنائیں۔ گھر کو قبر بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اس میں نماز، دعا، تلاوت ترک کر دی جائے اور وہ قبر کی طرح ہو جائے جہاں عبادت ممنوع ہے۔ پس آپ نے حکم دیا ہے کہ زیادہ تر عبادت گھروں ہی میں کی جائے، قبروں کے پاس نہ کی جائے اور یہ اس کے برعکس ہے جسے مشرک، عیسائی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے بہت سے نام نہاد مسلمان بعد میں کرنے لگے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنی نمازوں کا کچھ حصہ اپنے گھروں ہی میں پڑھا کرو اور گھروں کو قبریں مت بناؤ۔''[1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے گھروں کو مقبرے مت بناؤ، شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جہاں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے۔''[2]

اس ممانعت کے بعد فرمایا کہ جہاں بھی ہو مجھ پر درود بھیجو، وہ مجھے پہنچ جائے گا اگر چہ کتنی دور سے بھیجو۔[3] دوسری حدیث میں درود کے لفظ کے بجائے سلام کا لفظ ہے کہ آپ نے فرمایا:

---

[1] صحیح البخاری، الصلاۃ، باب کراھیۃ الصلاۃ فی المقابر، حدیث:432وصحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ ......الخ، حدیث:777

[2] صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ ...... الخ، حدیث:780

[3] مصنف ابن أبی شیبہ: 2/83/2 و صحیح ابن خزیمۃ: 48/4و ابن عساکر: 1/217/4و مصنف عبد الرزاق:6694/577/3۔ اس کی سند مرسل ہے اور اس میں سہیل بن ابی سہیل مجہول راوی ہے لیکن اس کے لیے ابو داود اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح شاہد موجود ہے دیکھیے: سنن أبی داود، المناسك، باب زیارۃ القبور، حدیث:2042و مسند أحمد:367/2

''تم کہیں بھی ہو، مجھے تمھارا سلام پہنچ جائے گا۔''[1] یعنی تم میری قبر سے کتنے ہی فاصلے پر ہو تمھارا سلام پہنچ جائے گا۔ لہٰذا کوئی ضرورت نہیں کہ میری قبر کو ایسا مزار بنالو جس کی ہمیشہ زیارت کی جائے اور کوئی حاجت نہیں کہ اسے عید بناؤ جہاں بار بار آنا ضروری ہو۔

ہمارا درود وسلام آپ ﷺ تک پہنچا دینے کے بارے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں۔

چنانچہ امام ابوداود رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی مجھے سلام کرے گا اللہ میری روح کو واپس لوٹا دے گا اور میں اس کے سلام کا جواب دے دوں گا۔''[2] نیز ابوداود نے حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات مجھ پر زیادہ درود بھیجا کرو کیونکہ تمھارا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ہمارا درود آپ پر کس طرح پیش کیا جائے گا حالانکہ آپ کا جسم تو مٹی میں مل چکا ہوگا؟ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے اجساد کو زمین کے لیے حرام کر دیا ہے۔''[3]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی میری قبر کے پاس مجھ پر درود بھیجے گا، اسے میں سن لوں گا اور جو کوئی دور سے درود بھیجے

---

[1] مصنف ابن أبي شيبه: 2/83/2و مسند أبي يعلى و فضل الصلاة على النبي (لإسماعيل القاضي)۔ اور ضیاء المقدسی کی المختارۃ:1/154۔ خطیب کی الموضح:2/30۔ اس کی سند میں علی بن عمر مستور ہے لیکن ابوداود اور احمد کی روایت اس کی مؤید ہے دیکھیے: سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث: 2042 و مسند أحمد:2/367۔ لیکن اس میں سلام کی بجائے درود کے الفاظ ہیں۔

[2] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2041۔ اس کی سند حسن ہے۔

[3] سنن أبي داود، الصلاة، باب تفريع أبواب الجمعة، باب فضل يوم الجمعة......، حديث: 1047و سنن النسائي، الجمعة، باب إكثار الصلاة على النبي يوم الجمعة حديث:1375۔ یہ روایت صحیح ہے۔

گا وہ مجھے پہنچایا جائے گا۔"[1] امام نسائی وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: "اللہ میری قبر پر فرشتے مقرر کردے گا جو مجھے میری امت کا سلام پہنچائیں گے۔"[2] ان کے علاوہ بھی اس موضوع کی کئی احادیث ہیں۔

پھر آپ کے اہلِ بیت میں سے بہت زیادہ فضیلت کے حامل تابعی، زین العابدین علی بن حسن رحمہ اللہ نے بھی مذکورہ بالا حدیث سے استدلال کرتے ہوئے ایک شخص کو منع کیا کہ دعا کے لیے قبر نبوی کا قرب منتخب نہ کرے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ قبر نبوی کا دعا وغیرہ جیسے امور کے لیے قصد کرنا اسے عید بنا لینا ہے۔ یہ حدیث زین العابدین رحمہ اللہ کو اپنے والد اور دادا کے واسطے سے پہنچی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ اس کا مطلب بعد میں آنے والوں سے بہتر سمجھنے والے تھے۔

اسی طرح سید اہل بیت یعنی حسن بن حسن رحمہ اللہ نے بھی ناپسند کیا کہ آدمی خاص سلام کرنے کی غرض سے قبر نبوی پر جائے کیونکہ ایسا کرنا ان کے خیال میں اسے عید بنالینا ہے۔ دیکھیں اہل مدینہ اور اہل بیت نبوی سے یہ سنت کیسے جاری ہوئی جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جوار اور قرابت کا شرف حاصل تھا۔ یقیناً یہ لوگ سنت کو سب سے زیادہ سمجھنے والے تھے

---

[1] الحاوی للفتاوی (للسیوطی): 265/2 و شعب الإیمان، باب فی تعظیم النبی صلی اللہ علیہ وسلم وإجلاله وتوقیره، حدیث: 1583۔ مناوی نے فیض القدیر میں لکھا ہے کہ اسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں جید سند والی لکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن مروان ضعیف راوی ہے۔ عقیلی کہتے ہیں کہ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ ابن دحیہ کہتے ہیں کہ یہ موضوع روایت ہے کیونکہ اس کی سند میں محمد بن مروان کذاب راوی ہے۔ اسے ابن جوزی نے بھی موضوعات میں ذکر کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: السلسلة الضعیفة: 203۔

[2] سنن النسائی، السهو، باب التسلیم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث: 1283 وسنن الدارمی، الرقاق، باب فضل الصلاة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدیث: 2774 ومسند أحمد: 452,441,387/1۔ اس کی سند صحیح ہے۔

اور انھی کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، اسی لیے انھوں نے اس کی سب سے زیادہ حفاظت کی۔

عید کا لفظ جب کسی جگہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں عبادت وغیرہ کے لیے اجتماع اور آمد کا قصد کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام، منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کو بندوں کے لیے عید بنادیا ہے، جہاں وہ دعا، عبادت اور ذکر کے لیے بار بار جمع ہوتے ہیں۔ مشرکین نے بھی اپنے لیے ایسے ہی مقامات مقرر کر رکھے تھے مگر جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب کو مٹا ڈالا۔

صالحین رحمۃ اللہ علیہم کی قبریں

اس دوسری قسم کی جگہوں میں انبیاء وصالحین کی قبور بھی شامل ہیں۔ خواہ وہ اصلی ہوں یا فرضی، بلکہ عام مسلمانوں کی قبروں کا یہی حکم ہے۔ مسلمان کی قبر کا احترام سنت ہے کیونکہ قبر فوت شدہ مسلمان کا گھر ہوتی ہے، لہٰذا اس پر نجاست ڈالنی چاہیے نہ اسے پیروں سے روندنا چاہیے اور جمہور علماء کے فتوے کے مطابق اس پر ٹیک بھی نہیں لگانا چاہیے، نیز قبر کے پاس برے افعال واقوال سے بھی اجتناب ضروری ہے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ جب آدمی قبر پر جائے تو صاحبِ قبر کو سلام بھیجے اور اس کے حق میں دعا کرے کیونکہ مردہ جتنے بڑے مرتبے کا ہوگا، اس کا حق بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔

میت کے لیے دعا

حضرت بریدہ بن حصیب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قبرستان کی طرف جاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انھیں یہ دعا سکھلاتے تھے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، وَالْمُسْلِمِينَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ أَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ»

''اے قبروں والو تم پر سلام ہو! جو مومن اور مسلمان ہیں۔ ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے ہی والے ہیں۔ میں اپنے لیے اور تمھارے لیے عافیت کا طالب ہوں۔''[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبرستان کی طرف تشریف لے گئے تو فرمایا:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ وِإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ»

''تم پر سلام ہو اے مومنو! ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے ہی والے ہیں۔''[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طویل روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جبریل علیہ السلام نے مجھے خبر دی کہ تیرا رب تجھے حکم دیتا ہے کہ بقیع میں جا کر مردوں کے لیے مغفرت کی دعا کر۔'' عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا: کس طرح دعا کرنی چاہیے؟ تو آپ نے یہ دعا بتائی:

«اَلسَّلَامُ عَلٰى أَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ، وَالْمُسْلِمِينَ وَيَرْحَمُ اللهُ الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِينَ وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلَاحِقُونَ»

''مومنوں اور مسلمانوں پر سلام ہو۔ اللہ رحم کرے ہمارے آگے جانے والوں اور بعد میں جانے والوں پر۔ ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے ہی والے ہیں۔''[3]

سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجرے

---

① صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، حديث: 975

② صحيح مسلم، الطهارة، باب استحباب إطالة الغرة والتحجيل في الوضوء، حديث: 249

③ صحيح مسلم، الجنائز، باب ما يقال عند دخول القبور والدعاء لأهلها، حديث: 974

سے باہر تشریف لے گئے۔ میں نے تلاش کیا تو آپ بقیع میں موجود تھے اور یہ دعا کر رہے تھے:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ أَنْتُمْ لَنَا فَرَطٌ وَّإِنَّا بِكُمْ لَاحِقُونَ اللَّهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُمْ وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُمْ»

''اے مومنو! تم پر سلام ہو۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمھارے پیچھے آنے والے ہیں۔ اے اللہ! ہمیں ان کے ثواب سے محروم نہ کر اور ہمیں ان کے بعد فتنے میں نہ ڈال۔''[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ کے قبرستان کے پاس سے گزرے تو آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

«اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْقُبُورِ يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْأَثَرِ»

''اے اصحاب قبور، تم پر سلام ہو، اللہ ہماری اور تمھاری مغفرت فرمائے۔ تم ہمارے پیش رو ہو اور ہم تمھارے پیچھے آ رہے ہیں۔''[2]

''حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے شہدائے اُحد پر جنگ کے آٹھ سال بعد نماز جنازہ پڑھی تھی۔[3] ابوداود نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب نبیٔ اکرم ﷺ میت کو دفن کر لیتے تھے تو قبر کے سامنے کھڑے ہوتے اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرماتے: ''اپنے بھائی کے لیے مغفرت اور ثابت قدمی کی دعا کرو کیونکہ اب اس سے سوال کیا

---

[1] سنن ابن ماجه، الجنائز، باب ماجاء فيما يقال إذا دخل المقابر، حديث : 1546

[2] جامع الترمذي، الجنائز، باب ما يقول الرجل إذا دخل المقابر، حديث : 1053

[3] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة أحد، حديث:4042 وصحيح مسلم، الفضائل، باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته، حديث: 2296۔ آٹھ سال کی صراحت صرف بخاری شریف میں ہے۔

جارہا ہے۔''[1]

یہ نبیٔ معظم ﷺ کی سنت تھی اور آپ امت کو اسی کا حکم دیتے تھے۔ جب بھی میت کو دفن کرتے یا قبور کی زیارت کرتے یا ادھر سے گزرتے تو آپ کا یہی معمول ہوتا تھا۔

یہ چیز میت کے لے اسی طرح تحیہ وسلام ہے جس طرح زندوں کے لیے تحیہ وسلام ہوتا ہے، نیز اس کے لیے بھی اس طرح دعا ہے جس طرح زندوں کے لیے دعا کی جاتی ہے۔ میت کے لیے دعا کے ضمن میں آدمی اپنے اور تمام مسلمانوں کے لیے بھی دعا کرتا ہے۔ یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت تھی اور یہی سبقت لے جانے والے اولین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ تھا۔ یہی تمام مسلمانوں کے لیے مشروع کیا گیا ہے اور نبی ﷺ کی قبر پر بھی لوگ یہی عمل کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ابن بطہ نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے نافع رحمہ اللہ سے پوچھا: کیا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قبر نبوی کو سلام کرتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں! میں نے انھیں سیکڑوں مرتبہ دیکھا ہے کہ قبر کے پاس جا کر کھڑے ہوتے تھے اور کہتے تھے: ''نبیٔ کریم (ﷺ) پر سلام ہو، ابوبکر (رضی اللہ عنہ) پر سلام، میرے باپ عمر (رضی اللہ عنہ) پر سلام۔'' پھر چلے جاتے تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے بھی موطأ میں یہ روایت ذکر کی ہے۔[2]

زیارتِ قبور

قبروں کی زیارت مطلق طور پر بغیر کسی پابندی کے جائز ہے، حتیٰ کہ کفار کی بھی۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے

---

[1] سنن أبي داود، الجنائز، باب الا ستغفار عند القبر......الخ، حديث:3221۔اس کی سند صحیح ہے۔
[2] اسے ابن بطّہ نے ''الإبانہ'' میں ذکر کیا ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اپنی ماں کی مغفرت کی اجازت چاہی تو اجازت نہیں ملی، لیکن ان کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تو اللہ نے دے دی۔"[1] اور صحیح مسلم میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی اور وہاں اس قدر روئے کہ آپ کے ساتھی بھی رونے لگے۔ پھر فرمایا: "میں نے ماں کی مغفرت کی اجازت مانگی تو اللہ نے نہیں دی لیکن قبر پر آنے کی اجازت مانگی تو دے دی، لہٰذا قبروں کی زیارت کیا کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔"[2] نیز امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، مگر اب زیارت کیا کرو۔"[3] احمد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ "جو زیارت کرنا چاہے کرے، مگر وہاں بری باتیں نہ کرے۔"[4] امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "میں نے تمھیں زیارت قبور سے منع کیا تھا مگر اب زیارت کیا کرو کیونکہ وہ تمھیں آخرت یاد دلائیں گی۔"[5]

کافر کی قبر کی زیارت

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ممانعت کے بعد زیارت قبور کی اجازت دی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ قبریں موت اور آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔ اس طرح آپ نے ہمیں عام اجازت دے دی ہے کہ مسلمان اور کافر سب کی قبروں کی زیارت کریں۔ حدیث میں

---

① صحیح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه عزوجل فی زیارة قبر أمه، حدیث: 976

② صحیح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه ...... الخ، حدیث: 976

③ صحیح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه ......الخ، حدیث: 977

④ سنن النسائی، الجنائز، باب زیارة القبور، حدیث: 2035 و مسند أحمد: 361/5۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔

⑤ مسند أحمد: 255/5۔ اس روایت کی سند صحیح ہے۔

زیارت قبور کی جو علت و مصلحت بتائی گئی ہے، یعنی موت و آخرت کی یاد دہانی وہ مسلمانوں کی طرح کافر کی قبر سے بھی ہوتی ہے، لہٰذا اس کی زیارت بھی جائز ہے۔ البتہ مسلمان میت کے لیے مغفرت کی دعا بھی کی جائے گی، جیسا کہ نبی ٔکریم ﷺ کی سنت ہے کیونکہ یہ صرف مسلمان کا حق ہے جبکہ کافر کے لیے دعائے مغفرت تو نہیں ہوگی، البتہ اس کی قبر سے عبرت و نصیحت حاصل کی جائے گی۔

زیارتِ قبور کے لیے سفر

علماء میں اختلاف ہے کہ زیارتِ قبور کے لیے سفر جائز ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جائز نہیں، بلکہ معصیت ہے اور اس میں نماز کو قصر کرنا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ اس طرح کا سفر بدعت ہے اور اسے عہد سلف میں کسی نے بھی اختیار نہیں کیا اور اس لیے بھی کہ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''صرف تین مقامات کے لیے شَدِّ رحال، یعنی سفر کیا جا سکتا ہے: مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور میری یہ مسجد۔''[1] یہ حکم عام ہے اور اس میں ہر وہ سفر داخل ہے جو کسی مسجد، مزار یا جگہ کے لیے اختیار کیا جائے بشرطیکہ اس سے مقصود تقرب الٰہی ہو۔ اس عموم کی دلیل یہ ہے کہ بصرہ بن ابی بصرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو جبل طور سے، جہاں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تھا، واپس آتے دیکھا تو پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ انھوں نے کہا: طور میں نماز پڑھ کر آ رہا ہوں۔ بصرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر وہاں جانے سے پہلے میں تمھیں دیکھ لیتا تو تم نہ جاتے کیونکہ نبی ٔاکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''صرف تین مسجدوں کے لیے شدِّ رحال (یعنی سفر) کیا جا سکتا ہے یعنی مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔''[2] راوی حدیث نے

---

[1] صحيح البخاري، الصوم، باب صوم يوم النحر، حديث:1995 و صحيح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلى حج وغيره، حديث: 827

[2] مسند أحمد : 8/6 اس کی سند صحیح ہے۔

اس کا مطلب یہی سمجھا کہ جبل طور وغیرہ انبیاء علیہم السلام کے مقامات بھی اس عام حکم میں داخل ہیں اور یہ کہ ان کا سفر اختیار کرنا روا نہیں، جس طرح مذکورہ بالا تین مسجدوں کے سوا کسی مسجد کے لیے سفر کرنا روا نہیں۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سفر جائز ہے۔ یہ قول ابو حامد غزالی، ابوالحسن حرانی، شیخ ابو محمد مقدسی اور بعض علمائے متاخرین کا ہے اور میرے علم میں متقدمین میں سے کسی سے منقول نہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ سفر والا حکم عام نہیں ہے اور یہ سفر زیارت قبور والا اس میں داخل نہیں ہوتا ان کی دلیل یہ ہے کہ اس میں وہ سفر بھی داخل نہیں ہیں جو ان مقامات کے لیے اختیار کیے جائیں جہاں آدمی کے والدین، علماء، مشائخ، احباب ہوں یا جہاں مباح دنیاوی معاملات تعلق رکھتے ہوں۔ البتہ اس بارے میں سب متفق ہیں کہ بدعت کے جو کام قبروں پر کیے جاتے ہیں، بالکل ناجائز ہیں۔

قبروں کے ساتھ مساجد

قبروں کے پاس نماز پڑھنا، قبروں کو مسجدیں قرار دینا، ان پر مسجدیں تعمیر کرنا قطعاً ناجائز ہے کیونکہ متواتر نصوص سے ان کی ممانعت اور ان کے متعلق سخت احکام ثابت ہیں۔ قبروں پر مساجد کی تعمیر سے تمام علماء نے منع کیا ہے۔ حنبلی، مالکی اور شافعی علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ فعل حرام ہے لیکن بعض علماء نے اسے مکروہ کہا ہے۔ معلوم نہیں کہ ان کی مراد مکروہ تحریمی ہے یا تنزیہی۔ بغیر شک وشبہ کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ حرام ہے کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت جندب بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ اپنی وفات سے پانچ دن پہلے فرما رہے تھے: ”اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مساجد قرار دے لیتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو مساجد قرار نہ دینا، میں تمھیں ایسا کرنے سے منع کرتا ہوں۔“[1]

---

[1] صحیح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور......، حدیث: 532

حضرت عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مرض الموت میں بیماری کی شدت سے کبھی کپڑا منہ پر ڈالتے اور کبھی ہٹا لیتے اور آپ اسی حالت میں فرما رہے تھے: ''یہود ونصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔''[1] آپ نے یہ فرما کر مسلمانوں کو یہود ونصاریٰ کا سا عمل کرنے سے ڈرایا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہود ونصاریٰ پر اللہ تعالیٰ کی مار اور پھٹکار ہو جنھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔''[2]

دیکھیں آپ نے زندگی کے آخری دنوں میں بھی قبروں کو مسجدیں قرار دینے سے منع فرمایا۔ اسی قدر نہیں بلکہ اس فعل کے مرتکب پر لعنت بھی کی ہے اور یہ صرف اس لیے کہ اپنی امت کو اس سے خبردار کردیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مرض الموت میں آپ نے فرمایا: ''یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مساجد قرار دے لیا۔'' یہ روایت بیان کر کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہا کرتی تھیں کہ اگر یہی خطرہ نہ ہوتا تو آپ کی قبر بھی کھلی جگہ بنائی جاتی، لیکن ڈر پیدا ہوا کہ مبادا اسے بھی مسجد ٹھہرا لیا جائے۔[3]

امام احمد، ابوداود، ترمذی اور نسائی رحمۃ اللہ علیہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کی (کثرت سے) زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں کو

---

① صحيح البخاری، الصلاة، باب 55، حديث:436,435 و صحيح مسلم، المساجد ، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، حديث:531

② صحيح البخاری، الصلاة، باب:55، حديث: 437و صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، حديث: 530

③ صحيح البخاری، الجنائز، باب مايكره من اتخاذ المساجد على القبور، حديث:1330 صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، حديث: 529

مسجدیں قرار دینے والوں اور ان پر چراغاں کرنے والوں پر لعنت کی ہے۔[1]

غرض اس باب میں کثرت سے احادیث و آثار وارد ہیں جن کے جمع کرنے کا یہ مقام نہیں۔ پس یہ مسجدیں جو انبیاء علیہم السلام صالحین رحمۃ اللہ علیہم اور بادشاہوں کی قبروں پر کھڑی کی گئی ہیں ان کا ازالہ ضروری ہے۔ جملہ مشہور و معروف علماء اس بارے میں متفق ہیں اور ایسی مسجدوں میں نماز کی کراہت کے قائل ہیں۔ بلکہ حنابلہ کے نزدیک تو ان میں نماز جائز ہی نہیں کیونکہ ممانعت و لعنت وارد ہے۔

پھر یہ ممانعت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے جب اس قسم کی کوئی مسجد غصب کی زمین پر بنائی گئی ہو۔ مثلاً بعض علماء و صالحین کی قبروں سے ملحقہ زمین غصب کر کے مساجد بنا دی گئی ہیں یا مدرسہ، خانقاہ یا مزار وغیرہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ فعل متعدد محرمات پر مشتمل ہے، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

① عام قبرستان کی زمین کو دفن کے علاوہ کسی اور کام میں استعمال کرنا جائز نہیں، نیز شارع عام پر بھی مسجد کھڑی کرنا روا نہیں۔

② قبرستان میں اس قسم کی عمارتیں بنانے کے لیے بہت سے مسلمانوں کی قبریں کھودنا پڑتی ہیں اور ان کی ہڈیاں نکالی جاتی ہیں، جیسا کہ بہت سے مقامات پر ہو چکا ہے۔

③ صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر عمارتیں کھڑی کرنے سے منع کیا ہے۔[2]

---

① جامع الترمذي، الصلاة، ماجاء في كراهية أن يتخذ على القبر مسجدا، حديث: 320و سنن أبي داود، الجنائز، باب في زيارة النساء القبور، حديث: 3236و سنن النسائي، حديث: 2045و مسند أحمد: 337,324,287,229/1۔ اس کی سند میں ابو صالح باذان ہے جو جمہور کے ہاں ضعیف ہے۔

② صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن تجصيص القبر و البناء عليه، حديث: 970۔

④ ان عمارتوں کے ساتھ بیت الخلا ہوا کرتے ہیں، حالانکہ مسلمان کی قبر سے نجاست دور رکھنی چاہیے۔

⑤ ایسا کرنا، قبروں کو مساجد قرار دے لینا ہے، حالانکہ یہ حرام ہے۔[1] جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔

⑥ قبروں پر روشنی کی جاتی ہے، حالانکہ نبیٔ کریم ﷺ نے اس فعل کے مرتکب پر لعنت کی ہے۔[2]

⑦ ایسا کرنے سے بہت سے افعال واقوال اور طریقوں میں اہل کتاب سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

① صحیح البخاری، الجنائز، باب مایکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور، حدیث: 1330 وصحیح مسلم، الجنائز، باب النھی عن بناء المسجد علی القبور......، حدیث: 529

② سنن أبی داود، الجنائز، باب فی زیارة النساء القبور، حدیث: 3236و جامع الترمذی، الصلاة، باب ماجاء من کراھیة أن یتخذ علی القبر مسجدا، حدیث: 320وسنن النسائی، الجنائز، باب التغلیظ فی اتخاذ السرج علی القبور2045، مسند أحمد: 287,229/1 ۔ اس کی سند میں ابوصالح باذان راوی ہے جو جمہور کے ہاں ضعیف ہے۔

فصل 9

قبر کے نزدیک نماز

اگر قبر کے پاس مسجد نہ بنائی گئی ہو تو بھی وہاں نماز پڑھنا روا نہیں۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اگر یہ ڈر نہ ہوتا کہ قبر نبوی کو مسجد قرار دے لیا جائے گا تو اسے کھلی جگہ میں بنایا جاتا۔[1] ظاہر ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی غرض یہ نہیں ہے کہ قبر پر مسجد تعمیر ہونے کا خدشہ تھا کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قبر پر مسجد کھڑی کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ لوگ وہاں نماز پڑھنے لگ جاتے۔

کسی جگہ کو نماز کے لیے منتخب کرنا، اسے مسجد قرار دے لینا ہے بلکہ ہر وہ جگہ، جہاں نماز پڑھی جائے، مسجد ہے اگرچہ وہاں کوئی عمارت موجود نہ بھی ہو۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے تمام زمین مسجد اور پاک کر دی گئی۔''[2] حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مقبرے اور حمام کے سوا باقی تمام زمین مسجد ہے۔''[3]

---

[1] صحیح البخاری، الجنائز، باب مایکرہ من اتخاذ المساجد علی القبور، حدیث: 1330 وصحیح مسلم، المساجد، باب النهی عن بناء المسجد علی القبور ...... الخ، حدیث: 529

[2] صحیح البخاری، الصلاة، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: جُعِلت لی الأرض مسجدا وطهورا، حدیث: 438 و صحیح مسلم، المساجد، باب المساجد و مواضع الصلاة، حدیث: 521

[3] سنن أبی داود، الصلاة، باب فی المواضع التی لاتجوز فیها الصلاة، حدیث: 492 وجامع الترمذی، الصلاة، باب ماجاء أن الأرض كلها مسجد إلا المقبرة والحمام، حدیث: 317۔ اس کی سند صحیح ہے۔

بعض فقہا کا خیال ہے کہ مقبرے میں نماز پڑھنا صرف اس وجہ سے مکروہ ہے کہ وہاں نجاست کا قوی احتمال ہے۔ اس لیے کہ مُردوں کا گوشت پوست اور خون وغیرہ مٹی میں مل جاتا ہے، پھر وہ اس خیال کی بنا پر نئے اور پرانے مقبروں میں فرق کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نئے مقبرے میں نماز جائز ہے کیونکہ وہاں نجاست کا خطرہ نہیں اور پرانے میں نجاست کے خطرے کی وجہ سے نماز جائز نہیں۔ اسی طرح قبر کی مٹی کے درمیان کسی رکاوٹ کے حائل ہونے اور نہ ہونے میں بھی فرق کرتے ہیں کہ اگر نمازی اور مٹی کے درمیان رکاوٹ ہو تو نماز جائز ہے ورنہ نہیں۔ بہر حال ان کے اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ مٹی میں نجاست شامل ہو جاتی ہے اور اس نجاست کی وجہ سے نماز جائز نہیں ہے اگر اس نجاست سے بچا جا سکے تو نماز جائز ہو جائے گی ورنہ نہیں۔ خواہ یہ قبرستان کا معاملہ ہو یا کسی اور جگہ کا۔

ان کا یہ نظریہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کیونکہ شارع علیہ السلام نے اس ممانعت کی بنیاد وہ نہیں بیان کی جو انھوں نے سمجھ لی ہے، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صاف لفظوں میں بیان کر دیا کہ یہود و نصاریٰ میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بنا لیتے تھے۔[1] اور فرمایا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت، جنھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔''[2] اور فرمایا: یا اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دینا، جس کی پوجا کی جائے۔ اللہ کا غصہ ان لوگوں پر بہت سخت ہو گیا جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا۔''[3] اور فرمایا: ''تم

---

[1] صحیح البخاری، الصلاۃ، باب ھل تنبش قبور مشرکی الجاھلیۃ ...... الخ، حدیث: 427 وصحیح مسلم، المساجد، باب النھی عن بناء المسجد علی القبور ...... الخ، حدیث: 528

[2] صحیح البخاری، الصلاۃ، باب: 55، حدیث: 436 و صحیح مسلم، المساجد، باب النھی عن بناء المسجد علی القبور ...... الخ، حدیث: 530

[3] موطأ الإمام مالك، كتاب قصر الصلاۃ فی السفر، باب جامع الصلاۃ، حدیث: 423 و مسند أحمد: 2/246۔ مسند احمد والی سند حسن ہے۔

سے اگلے لوگ قبروں کو مسجدیں قرار دے لیا کرتے تھے، خبردار! تم ایسا نہ کرنا، میں تمھیں اس سے منع کر رہا ہوں۔‘‘[1]

اس نوعیت کی بہت سی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ممانعت کی وجہ نجاست کا احتمال نہیں، بلکہ یہ احتمال ہے کہ کہیں قبروں کو بت نہ بنا لیا جائے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا: میں مکروہ سمجھتا ہوں کہ کسی آدمی کی اتنی تعظیم کی جائے کہ اس کی قبر کو مسجد بنا لیا جائے، کیونکہ اس میں خود اس آدمی کے لیے اور اس کے بعد لوگوں کے لیے فتنہ ہے۔ اور پھر واضح ہے کہ یہ احتمال نہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صالح آدمی کی قبر کھودی جائے گی اور اندر کی مٹی اوپر آئے گی، بلکہ قبر پر تو نجاست ہوتی ہی نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قبر کے متعلق علت بیان کرتے ہوئے یہ دعا فرمائی کہ ’’یا اللہ! میری قبر کو بت نہ بننے دیجیے کہ اس کی پرستش کی جائے۔‘‘[2] اسی طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ ایسی ہی قبروں کو مسجدیں قرار دیتے تھے جو نجاست سے پاک ہوتی تھیں، مگر اس کے باوجود ان پر محض اس فعل کی وجہ سے لعنت کی گئی۔ پھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’قبروں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو نہ ان پر بیٹھو۔‘‘[3] اور اہل کتاب کی حالت اس طرح بیان فرمائی ہے کہ ’’جب ان میں سے کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد بنا دیتے تھے اور اس میں تصویریں بناتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے دن بدترین مخلوق ہوں گے۔‘‘[4]

---

[1] صحیح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور...... الخ، حديث: 532

[2] موطأالإمام مالك، كتاب قصر الصلاة فى السفر، باب جامع الصلاة، حديث:423 ومسند أحمد: 246/2۔ مسند احمد والی سند حسن ہے۔

[3] صحيح مسلم، الجنائز، باب النهي عن الجلوس على القبر والصلاة عليه، حديث: 972

[4] صحيح البخاري، الصلاة، باب هل تنبش قبور مشركي الجاهلية ...... الخ، حديث:427 وصحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور ...... الخ، حديث:528

بت پرستی کیوں کر شروع ہوئی؟

اسی طرح مروی ہے کہ لات کی پرستش قبر کی تعظیم سے شروع ہوئی۔ قوم نوح کے بت یعنی ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ دراصل نیک آدمیوں کے نام ہیں جو آدم اور نوح کے درمیانی زمانے میں موجود تھے۔ لوگ ان کی پیروی کرتے تھے، جب وہ مرے تو ان کے ماننے والوں نے کہا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنا رکھیں تو عبادت کا شوق زیادہ پیدا ہوگا کیونکہ ان کی صورت ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہوگی، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر ان کے بعد جو نسل آئی اس نے کہا کہ ہمارے بزرگ انھی تصویروں کی پرستش کرتے تھے اور انھی کی برکت سے پانی برسا کرتا تھا۔ اس طرح ان کے بت بن گئے اور پوجا شروع ہوگئی، پھر عرب بھی ان کی عبادت کرنے لگے۔[1]

یہی علت ہے، جس کی بنا پر شارع علیہ السلام نے اس فعل سے منع کیا ہے۔ اسی فعل نے بہت سی قوموں کو شرک اکبر یا کم درجے کے شرک میں مبتلا کر دیا ہے۔ بہت سے لوگوں نے صالحین یا ستاروں وغیرہ کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔

اگر کوئی آدمی کسی ایسے شخص کی قبر کی وجہ سے شرک کرتا ہے جس کو وہ نبی یا بزرگ تسلیم کرتا ہے تو اس کا یہ شرک اس شرک سے کہیں زیادہ سخت ہے جو لکڑی یا پتھر کے بنے ہوئے بت کی وجہ سے کیا جائے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ لوگ قبروں کے سامنے اس طرح گڑگڑاتے، خشوع ظاہر کرتے اور سچے دل سے عبادت کرتے ہیں کہ ویسی عبادت مسجدوں میں ان سے

---

[1] تفسیر الطبری: 29 / 98، 99 و تفسیر ابن کثیر: تفسیر سورة نوح آیت: 23 وفتح القدیر: 360/5۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی تقریباً یہی تفسیر مروی ہے دیکھیے: صحیح البخاری، التفسیر، تفسیر سورة نوح، باب: 1 حدیث: 4920

نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ تو قبروں کو سجدہ بھی کرتے ہیں اور قبروں کے پاس نماز پڑھنے اور دعا کرنے میں اتنی برکت سمجھتے ہیں جو شدِّ رحال یعنی سفر والی تینوں مسجدوں، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی میں بھی نہیں سمجھتے۔

یہی وہ خرابی ہے، یعنی شرک والی خرابی، خواہ زیادہ مقدار میں ہو یا کم مقدار میں، جس کی جڑ نبی کریم ﷺ نے کاٹ دی ہے، حتیٰ کہ مقبرے میں سرے سے نماز پڑھنے ہی کی ممانعت کر دی ہے، خواہ نماز پڑھنے والا اس خاص جگہ نماز پڑھنے کی برکت کا قائل نہ بھی ہو۔ یہ ممانعت اسی قسم کی ہے، جس قسم کی طلوع وغروب اور سورج کے نصف النہار میں ہونے کے وقت نماز کی ممانعت ہے کیونکہ انھی اوقات میں مشرکین سورج کی پرستش کیا کرتے تھے اور یہ مخالفت محض اس اصل کی بنا پر ہے کہ شرک کے ادنیٰ ذریعہ اور سبب کا بھی سدباب ہو جائے۔ جب آدمی جان بوجھ کر کسی نبی یا بزرگ کی قبر کے پاس نماز پڑھنے میں زیادہ خیر و برکت سمجھتا ہے تو وہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صاف طور پر لڑائی کرتا ہے اور ایک ایسا دین ایجاد کرتا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی کیونکہ تمام مسلمانوں کو صاف وصریح طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ قبر کے پاس نماز پڑھنا دین محمدی میں ثابت نہیں ہے، خواہ کسی کی بھی قبر ہو اور اس نماز میں ہرگز کوئی خوبی نہیں ہے، بلکہ سراسر بُرائی ہے۔

افراط وتفریط

ممکن ہے کہ کسی خاص جگہ فرشتوں اور رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہو، اور اس جگہ کو بزرگی اور شرف بھی حاصل ہو، لیکن وہاں پر بھی افراط وتفریط کے درمیان ہی دین اسلام ہے، افراط میں دین ہے نہ تفریط میں۔ نصاریٰ نے انبیاء علیہم السلام کی تعظیم میں اس قدر افراط اور غلو سے کام لیا کہ ان کی پرستش کرنے لگے اور یہود نے اس قدر تفریط اختیار کی کہ انھیں قتل کرنے لگے، لیکن

امت وسط یعنی مسلمانوں کی راہ درمیانی راہ ہے۔ ان کے ہاں نصاریٰ کی افراط ہے نہ یہود کی تفریط۔ اسی لیے نبئ کریم ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اتنا نہ بڑھا دینا جتنا نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھا دیا ہے۔ میں صرف ایک بندہ ہوں، لہٰذا کہو: (محمد ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول (ہیں)۔''[1]

اگر فرض کرلیا جائے کہ اس مقام پر نماز ادا کرنا دوسرے مقام پر نماز کی ادائیگی سے زیادہ رحمت کا باعث ہے تو بھی اس سے پرہیز کرنا چاہیے، کیونکہ اس نماز سے جو نقصان اور مضرت پیدا ہوتی ہے، وہ اس رحمت سے کہیں زیادہ ہے بلکہ یہ مضرت اس رحمت کو سرے سے زائل کر دینے والی اور عذاب لانے والی ہے۔ جو کوئی اتنی عقل نہیں رکھتا کہ اس مضرت کو سمجھ سکے، اسے چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرے کیونکہ اگر وہاں نماز پڑھنے میں مضرت نہ ہوتی تو آپ ہرگز منع نہ فرماتے۔ شراب میں فوائد بھی ہیں لیکن چونکہ نقصان کا پلہ بھاری ہے اس لیے اسے حرام قرار دیا گیا۔ بس اسی طرح ہی پچھلی بات کو سمجھ لینا چاہیے۔ مومن کے لیے روا نہیں کہ رسولوں کے مصالح ومفاسد کے دلائل طلب کرے، اس کا کام تو صرف اس قدر ہے کہ ان کی اطاعت کرے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾

''ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اس لیے بھیجا ہے کہ اللہ کی اجازت سے ان کی اطاعت کی جائے۔''[2]

اور فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿واذكر في الكتاب مريم......﴾ حديث: 3445

[2] النساء 64:4

﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ﴾

''جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''[1]

انبیاء واولیاء کے حقوق

اور یہ اس لیے کہ تعظیم وتوقیر اور محبت کے معاملات میں جو انبیائے کرام کے حقوق ہیں وہ آدمی کی جان، مال اور اہل وعیال پر مقدم ہیں۔ ان کی اطاعت اور ان کی سنتوں کی پیروی واجب ہے۔ جو لوگ ان کے یہ حقوق کما حقہ ادا کرتے ہیں وہ ہرگز ان کی عبادت نہیں کر سکتے اور نہ انھیں اللہ کا شریک بنا سکتے ہیں، اسی طرح صدیقین وصالحین کے بھی حقوق ہیں مثلاً محبت وتعظیم وغیرہ، جو کتاب وسنت سے معلوم ہو چکے ہیں، مگر عبادت کے درجہ تک ان کی تعظیم کسی حال میں بھی روا نہیں۔

[1] النساء 80:4

دعا

قبروں پر یا دوسرے مقامات پر دعا کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ اتفاق سے کسی جگہ دعا کرلی جائے۔ مثلاً آدمی راستے میں جارہا ہے کہ دعا کا خیال پیدا ہوا اور دعا کرنے لگا، اسی حالت میں اس کا قبروں کی طرف سے گزر ہوا یا بالارادہ ان کی زیارت کو گیا، سنت کے مطابق مُردوں کو سلام کیا اور اپنے اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کی، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قبروں کے پاس دعا کرنے کا جان بوجھ کر ارادہ کرے اور سمجھے کہ وہاں مانگی گئی دعا دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ قبول ہوتی ہے تو یہ صورت ممنوع ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔

گرجا گھر

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ آدمی راستہ چلتے ہوئے دعا کررہا ہے اور راستے میں بت، صلیب یا گرجا گھر واقع ہے، مگر چونکہ یہ چیزیں اس کے ذہن میں دعا کے لیے مقصود نہیں ہیں، اس لیے وہ گناہ گار نہیں اور اس کی دعا جائز ہے، یا یہ کہ وہ کسی ایسی جگہ دعا میں مصروف ہے جہاں صلیب بھی ایک طرف موجود ہے مگر وہ اس کے وجود سے غافل ہے، یا یہ کہ وہ کسی گرجا گھر میں رات بسر کرنے پر مجبور ہوگیا ہے اور اللہ سے دعا کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ دعا کرنے کے لیے خصوصی طور پر گرجا گھر میں نہیں آیا۔ لیکن اگر جان بوجھ

کر دعا کے لیے کسی بت، صلیب یا گرجا گھر کا قصد کرتا ہے تو یہ سخت گناہ کی بات ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ اگر وہ کسی خاص گھر یا بازار میں کسی خاص دکان یا ستون کے پاس دعا کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے تو یہ بھی حرام ہے کیونکہ ان مقامات کی تخصیص ناجائز ہے اور دعا کو بھی ان مقامات کے پاس کوئی فضیلت نہیں ہے۔ قبروں کے پاس دعا کرنے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کو مساجد اور عید یعنی مزار بنانے اور ان کے پاس نماز پڑھنے سے خاص طور پر منع کر دیا ہے، اگرچہ ان میں بہت سے مقامات کی نسبت صراحتاً ممانعت نہیں کی۔ اور یہ جو مشہور روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی معاملہ کسی طرح تمھاری سمجھ میں نہ آئے تو اہل قبور سے مدد حاصل کرو۔''[1] تمام علمائے کرام کے متفقہ فیصلے کے ساتھ یہ روایت بالکل جھوٹی ہے اور رسول اللہ ﷺ پر محض تہمت ہے۔

قبروں کے پاس دعا

مزید تشریح کے لیے چند امور کو سمجھ لینا چاہیے:

1. یہ واضح ہو چکا کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنے سے نبی اکرم ﷺ نے جس علت کی بنا پر منع کیا ہے وہ یہ ہے کہ نماز شرک کا ذریعہ نہ بن جائے، ایسا نہ ہو کہ لوگ قبروں کی عبادت پر جھک پڑیں اور رغبت ورہبت (خوف) میں دل ان کی طرف رجوع کرنے لگیں۔

اور یہ بات واضح ہے کہ جب کوئی مصیبت زدہ قبروں کے پاس دعا کرتا ہے اور ان سے دل کی مراد وابستہ کرتا ہے تو اس کا معاملہ اس شخص سے کہیں زیادہ سخت ہوتا ہے جو حالت اطمینان وراحت میں قبر کے پاس نماز پڑھ لیتا ہے کیونکہ اول الذکر (پہلا شخص) اپنی مصیبت

[1] یہ روایت موضوع ہے جیسے کہ مصنف نے متن میں اشارہ کیا ہے اور اسے ابنِ کمال باشا نے اپنی ''اربعین'' میں ذکر کیا ہے مزید دیکھیے: کشف الخفاء: 88/1

کی وجہ سے ایک ایسی ذہنی کیفیت میں ہوتا ہے کہ وہ سخت ترین فتنے میں بآسانی مبتلا ہو جاتا ہے، اس کے برعکس آخر الذکر (دوسرے شخص) کے حق میں فتنے کا اندیشہ اتنا زیادہ قوی نہیں ہے۔ پس اگر شریعت نے فتنے کے خفیف احتمال کی وجہ سے بھی آخر الذکر کو قبر کے پاس نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی ہے تو ظاہر ہے اول الذکر کے معاملے میں ممانعت کس درجہ سخت ہوگی۔ یہ بات ہر اس شخص پر ظاہر ہے جو دین الٰہی میں تفقہ اور سمجھ رکھتا ہے۔ دینِ الٰہی خالص توحید کا مطالبہ کرتا ہے اور شرک کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ شکل بھی روا نہیں رکھتا۔

② قبروں کے پاس دعا کے لیے جانا اور سمجھنا کہ وہاں دعا دوسری جگہوں کی نسبت زیادہ قبول ہوتی ہے، یہ ایک ایسا فعل اور اعتقاد ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اجازت نہیں دی اور نہ ہی اسے صحابہ وتابعین اور مسلمانوں کے ائمہ میں سے کسی نے بیان کیا ہے بلکہ متقدمین علماء وصلحاء میں سے کسی ایک سے بھی یہ بات ثابت نہیں۔ یہ چیز ہمیں سب سے پہلے دوسری صدی ہجری کے بعد بعض متاخرین کے ہاں ملتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اصحاب بارہا قحط میں مبتلا ہوئے۔ بڑے بڑے مصائب انھیں پیش آتے رہے لیکن انھوں نے کبھی نبیٔ اکرم ﷺ کی قبر کی طرف رجوع کیوں نہیں کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب قحط پڑا تو وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو لے کر میدان میں نکلے اور ان کے واسطے سے دعا کی۔[1] نبیٔ کریم ﷺ کی قبر پاس ہی موجود تھی مگر وہاں جا کر کوئی دعا نہیں کی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ قحط میں انھوں نے قبر نبوی کھول دی تھی، کیونکہ بارش اللہ کی رحمت ہے اور وہ قبر نبوی پر نازل ہونی چاہیے۔ مگر یہ نہیں کیا کہ قبر کے پاس بارش کے لیے دعا یا فریاد کی ہو۔

---

① صحيح البخاري، الاستسقاء، باب سؤال الناس الإمام الاستسقاء إذا قحطوا، حديث:1010

اسی لیے تابعین کے زمانے میں جب آپ کا حجرہ از سرنو تعمیر کیا گیا تو اس کی چھت میں ایک روشن دان بنا دیا گیا تھا تا کہ اندر سے آسمان دکھائی دیتا رہے، پھر اس میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں۔ 650 ہجری کے بعد مسجد اور منبر میں آگ لگ گئی۔ اس کے کئی سال بعد حجرے کی چھت پر قبہ تعمیر کیا گیا لیکن لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔

دانیال نبی علیہ السلام کی لاش

محمد بن اسحاق نے مغازی میں ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ جب ہم نے تُستر (ایران) فتح کیا تو ہرمزان (گورنر) کے توشہ خانے میں ایک چارپائی نظر آئی۔ اس پر ایک میت پڑی ہوئی تھی اور اس کے سرہانے ایک کتاب رکھی تھی۔ ہم وہ کتاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائے۔ انھوں نے کعب رحمہ اللہ کو عربی میں اس کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا حضرت کعب کہتے ہیں: میں سب سے پہلا عرب ہوں جس نے قرآن کی طرح یہ کتاب پڑھی۔ اس میں عربوں کے بہت سے حالات اور آنے والے واقعات کی پیشین گوئیاں لکھی تھیں۔ ہم نے اس مردے کے لیے دن میں مختلف مقامات پر تیرہ قبریں کھودیں اور رات کو اسے چپکے سے ایک قبر میں دفن کر کے تمام قبریں برابر کر دیں تا کہ لوگوں کو اس کی اصلی قبر کا پتہ نہ چل سکے۔ ایرانی اس میت سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو اسے لے کر نکلتے تھے اور بارش کے لیے دعا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ لاش دانیال نبی علیہ السلام کی تھی۔

اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم نے اس میت کی قبر اس لیے گم کر دی کہ لوگ اس کی وجہ سے فتنے میں نہ پڑ جائیں۔ یعنی ان کے نزدیک قبروں کی اس طرح تعظیم وتکریم کرنا جائز نہ تھا۔ لوگ ہمیشہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر کی مثال پیش کر دیتے ہیں جسے اہل قسطنطنیہ بہت مقدس سمجھتے تھے۔ مگر قسطنطنیہ والوں کا یہ فعل شریعت میں

حجت ہے نہ ہی مسلمانوں کے لیے نمونہ۔

سلف صالحین رحمہم اللہ کا عمل

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی قبریں بہت سے مقامات پر موجود تھیں اور وہاں تابعین رحمہم اللہ اور ان کے بعد ائمہ رحمہم اللہ بھی موجود تھے، لیکن انھوں نے کبھی کسی صحابی کی قبر کے پاس جا کر دعا یا فریاد نہ کی، حالانکہ یہ چیز اگر جائز ہوتی تو وہ ضرور ایسا کرتے اور ہمیں اس کی خبر بھی پہنچتی۔

جس کسی کو کتب آثار اور تاریخ سلف میں غور کرنے کا موقع ملا ہے وہ پورے یقین سے جانتا ہے کہ وہ لوگ قبروں کے پاس دعا واستغاثہ نہیں کرتے تھے بلکہ اگر کسی جاہل کو ایسا کرتے ہوئے دیکھتے تو سختی سے منع کرتے تھے۔ جیسا کہ ہم پیچھے کچھ بیان کر چکے ہیں۔

اس بارے میں دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، ان مقامات پر دعا کرنا دوسرے مقامات پر دعا کرنے کی نسبت افضل ہوگا یا نہ ہوگا۔ اگر افضل ہے تو ممکن ہی نہیں کہ یہ بات صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین وتبع تابعین رحمہم اللہ سب سے مخفی رہ جاتی۔ خیر القرون تو اس فضل عظیم سے بے خبر رہتے اور بعد کے لوگوں کو اس کا علم ہو جاتا، لہٰذا یہ بات قابل قبول نہیں۔ اگر کہا جائے کہ سلف اسے جانتے تھے، تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس پر کبھی عمل کیوں نہیں کیا؟ پھر دعا کا معاملہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، جب مصیبت پڑتی ہے تو آدمی بڑی بے قراری سے دعا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور ہر طریقے سے مصیبت دور کرنے کی فکر کرتا ہے۔ سلف صالحین رحمہم اللہ پر بڑی بڑی مصیبتیں نازل ہوئیں، مگر انھوں نے کبھی قبروں کے پاس دعا نہیں کی۔ اگر فرض کیا جائے کہ قبروں کے پاس دعا کرنے میں صرف تھوڑی سی کراہت ہے تو بھی مصیبت کے وقت آدمی اتنی خفیف کراہت کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر اس طرح کی دعا بالکل ناجائز نہ ہوتی، بلکہ صرف مکروہ ہوتی تو سلف صالحین ضرور کبھی نہ کبھی اس پر مائل ہو جاتے۔ مگر ہمیں یقین سے

معلوم ہے کہ انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

قبروں کے پاس دعا کرنے کا گناہ

دوسری صورت میں اگر قبروں کے پاس دعا کرنا دوسرے مقامات پر دعا کرنے سے افضل نہیں ہے تو پھر خصوصیت سے وہاں دعا کرنا اسی طرح گمراہی و نافرمانی ہے جس طرح کسی درخت، دکان، راستے، دریا، پہاڑ وغیرہ یا کسی بھی چیز کو یہ خصوصیت دے دینا گمراہی و نافرمانی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَٰٓؤُاْ شَرَعُواْ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ﴾

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنھوں نے ایسے احکام دین مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔"[1]

اگر اللہ تعالیٰ نے قبروں کے پاس دعا کرنا واجب یا مستحب قرار نہیں دیا تو اسے واجب یا مستحب قرار دینے والا درحقیقت اسی آیت کی زد میں آتا ہے کیونکہ وہ اپنے عمل سے ایک ایسا دین قائم کر رہا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اور فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ ٱلْفَوَٰحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَٱلْإِثْمَ وَٱلْبَغْيَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ وَأَن تُشْرِكُواْ بِٱللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِۦ سُلْطَٰنًا وَأَن تَقُولُواْ عَلَى ٱللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾﴾

"آپ فرما دیجیے کہ یقیناً میرے رب نے حرام کیا ہے ان تمام بے حیائی والی باتوں کو جو علانیہ ہیں اور جو پوشیدہ ہیں، ہر گناہ کی بات کو، ناحق کسی پر ظلم کرنے کو اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ذمے ایسی بات لگا دو جو تم نہیں جانتے۔"[2]

---

[1] الشوریٰ 21:42 [2] الأعراف 33:7

قبروں کے پاس اس طرح کی عبادت بھی اس شرک میں سے ہے جس کی کوئی دلیل اللہ تعالیٰ نے نہیں اتاری، ایسی کوئی حجت موجود نہیں جس سے قبروں کے پاس دعا کا استحباب یا فضیلت ثابت ہو سکے، پس جو کوئی اسے دین الٰہی میں سے سمجھتا ہے وہ دراصل اللہ کی بابت لاعلمی کے ساتھ گفتگو کرتا ہے۔ ﴿مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا﴾ [1] کا جملہ کیا ہی خوب ہے۔ یہ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ان تمام بے ہودہ دلیلوں کا سدّ باب کر دیا ہے جو کہانیوں اور قصوں سے استنباط کی جاتی ہیں۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں بیان فرمائی ہے:

﴿وَحَاجَّهُ قَوْمُهُ قَالَ أَتُحَاجُّونِّي فِي اللَّهِ وَقَدْ هَدَانِ وَلَا أَخَافُ مَا تُشْرِكُونَ بِهِ إِلَّا أَن يَشَاءَ رَبِّي شَيْئًا وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا أَفَلَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿٨٠﴾ وَكَيْفَ أَخَافُ مَا أَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُونَ أَنَّكُمْ أَشْرَكْتُم بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا فَأَيُّ الْفَرِيقَيْنِ أَحَقُّ بِالْأَمْنِ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٨١﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٨٢﴾ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَا إِبْرَاهِيمَ عَلَىٰ قَوْمِهِ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿٨٣﴾﴾

''اور اس سے اس کی قوم نے جھگڑا کیا۔ تو اس (ابراہیم) نے فرمایا کہ کیا تم اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑا کرتے ہو؟ حالانکہ اس نے مجھ کو ہدایت دے دی ہے اور میں ان چیزوں سے، جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہو، نہیں ڈرتا۔ ہاں! اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے۔ میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم میں گھیرے ہوئے ہے، کیا تم پھر بھی خیال نہیں کرتے؟ اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے شریک بنالیا ہے، حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو

[1] الأعراف 33:7

شریک ٹھہرایا ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی؟ سو ان دو جماعتوں میں سے امن کا زیادہ مستحق کون ہے (بتاؤ) اگر تم خبر رکھتے ہو؟ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے، انھی کے لیے امن ہے اور وہی راہ راست پر چل رہے ہیں۔ اور یہ ہماری حجت تھی جو ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کی قوم کے مقابلے میں دی تھی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں۔ بے شک آپ کا رب بڑا حکمت والا، بڑا علم والا ہے۔''[1]

اسوۂ ابراہیمی

شرک اکبر اور شرک اصغر میں ملوث یہ مشرکین ہمیشہ اخلاص والے مومنین کو ڈراتے رہتے ہیں۔ ان کے جواب میں مومن کو وہی کہنا چاہیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے مشرکوں سے کہا تھا کہ ہم تمھارے معبودوں سے نہیں ڈرتے کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور نقصان پہنچانے کی ہرگز قدرت نہیں رکھتے، اگر اللہ تعالیٰ کسی پر کوئی تکلیف بھیجے تو اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دور کرنے والا نہیں۔ اور اگر وہ کسی پر رحمت نازل کرے تو اسے کوئی روکنے والا نہیں۔ ہم تمھارے ان معبودوں سے کیوں کر ڈر سکتے ہیں، جبکہ تم خالق ارض وسماء، یعنی اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے اور بے خوف وخطر اس کے دین حق میں اپنے دل سے ایجادیں کرتے ہو اور شریک پیدا کرتے رہتے ہو۔ یہ بتاؤ سلامتی اور بے خوفی کا زیادہ مستحق کون ہے۔ ہم جو اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اس کے دین میں کوئی شریک پیدا نھیں کرتے یا تم جو اس کی اجازت کے بغیر شریک پیدا کر چکے ہو۔ ایسی ہی روشن وقطعی حجتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اہل علم کے درجات بلند کر دیتا ہے۔

---

[1] الأنعام 6:80-83

قبر پرستوں کی حجتیں

اگر کہا جائے کہ ان اقوال وواقعات کی کیا تاویل ہوسکتی ہے جو بعض مشہور لوگوں سے نقل کیے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی بزرگ کا یہ کہنا کہ ''معروف کرخی کی قبر مجرب تریاق ہے'' بلکہ خود معروف کرخی کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے بھتیجے کو وصیت کی تھی کہ ان کی قبر پر آ کر دعا کیا کرے۔

اسی طرح بہت سے لوگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ انبیاء وصالحین کی قبروں کے پاس جا کر دعا کرتے تھے اور ان کی دعا مقبول ہوجاتی تھی۔

مناسک حج کے مصنفین نے لکھا ہے کہ آدمی جب قبر نبوی کی زیارت کرے تو اسے وہاں دعا بھی کرنی چاہیے۔

بعض نے لکھا ہے کہ قبر نبوی کے سامنے ستر مرتبہ درود پڑھنے کے بعد جو دعا بھی کی جائے مستجاب ہوجاتی ہے۔

بعض فقہا نے قبر نبوی پر تلاوتِ قرآن کو جائز بتایا ہے اور یہ دلیل پیش کی ہے کہ چونکہ وہ ایک ایسا متبرک مقام ہے جہاں سلام کرنا ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونا اور دعا کرنا جائز ہے، اس لیے وہاں تلاوت بھی جائز ہے۔

بعض لوگوں نے خواب میں دیکھا ہے کہ بزرگوں کی قبر پر کھڑے دعا کر رہے ہیں۔

بعض لوگوں نے اپنے تجربے بیان کیے ہیں کہ انھوں نے شیخ ابو الفرج شیرازی اور ان جیسے بزرگوں کی قبروں کے پاس دعا کی اور وہ قبول ہوگئی۔

جید عالموں اور اصحاب کرامت ولیوں کو دیکھا گیا ہے جو خصوصیت کے ساتھ قبروں کے

سامنے دعا کرتے اور جھکتے تھے۔[1] ظاہر ہے ایسے بڑے لوگ جاہل نہیں ہو سکتے اور نہ شریعت کے خلاف عمل کر سکتے ہیں۔

جواب شافی

یہ خلاصہ ہے ان تمام حجتوں کا جو قبر پرست اپنے مسلک کی تائید میں پیش کیا کرتے ہیں۔
ہمارا جواب یہ ہے کہ جس بات کو ہم مکروہ لکھ آئے ہیں، اس کے خلاف تینوں خیر القرون سے کوئی ایک لفظ بھی ہمارے علم و دانست میں بطریق صحیح روایت نہیں کیا گیا۔ یہ خیر القرون وہ زمانے ہیں جن کی نسبت نبیٔ کریم ﷺ نے فرما دیا ہے کہ ''میری امت کا سب سے اچھا زمانہ وہ ہے جس میں میری بعثت ہوئی ہے، پھر وہ زمانہ جو اس زمانے کے بعد ہے پھر وہ زمانہ جو اس زمانے کے بعد ہے۔''[2] اگر قبر پرستوں کا یہ طریقہ شرعاً مطلوب ہوتا یا اس میں کوئی ذرا بھی فضیلت ہوتی تو خیر القرون کے سلف صالحین اس سے بے خبر اور ان کے عمل سے غافل نہ رہتے۔ کیونکہ وہ ہر نیک علم و عمل میں بہت پیش قدم تھے۔ چونکہ انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لیے یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس فعل میں کوئی نیکی اور بھلائی نہیں ہے۔
رہ گئے بعد کے لوگ تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بارے میں مسلمان باہم مختلف ہو گئے ہیں۔ بعض علماء و صلحاء نے اسے جائز قرار دیا ہے اور اکثر نے اس سے منع کیا

---

[1] جہلا کے خیال میں ہر وہ شخص جید عالم ہے جو لمبی داڑھی رکھتا ہو، بڑی پگڑی باندھتا ہو، تسبیح ہاتھ میں لیے کچھ بڑبڑاتا ہو۔ ہم نے ایسے قبر پرست جید عالم دیکھے ہیں جو مُلّائیت کے یہ تمام سامان تو رکھتے تھے مگر بالکل جاہل تھے۔ اکثر صوفی مولوی اس قسم کے ہیں، مگر عوام کی نظر میں وہ جید عالم ہیں اور ان کا قول و فعل کتاب و سنت کے مقابلے میں بھی حجت تسلیم کیا جاتا ہے۔

[2] صحیح البخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب فضائل أصحاب النبی ﷺ، حدیث:3651 و صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب فضل الصحابة......الخ:2533

ہے۔ جب اس طرح کا اختلاف امت میں پیدا ہو جائے تو کتاب وسنت اور اجماع سلف صالحین کی طرف رجوع کرنا اور ان کے فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

امام شافعی رحمہ اللہ پر تہمت

الحمدللہ کہ کسی مشہور امام یا پیشوا سے کوئی ایک قول بھی اس بدعت کی تائید میں روایت نہیں کیا گیا اور اگر کچھ روایت کیا گیا ہے تو وہ سراسر جھوٹ اور تہمت ہے۔ جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی نسبت بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے کہا: ''جب کبھی مجھ پر کوئی سختی آتی ہے تو ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی قبر پر آ کر دعا کرتا ہوں اور سختی دور ہو جاتی ہے۔'' یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ پر سراسر بہتان ہے اور ہر صاحب علم پر اس کا دروغ اور جھوٹ ہونا ظاہر ہے کیونکہ امام شافعی رحمہ اللہ جب بغداد میں وارد ہوئے تھے تو وہاں کوئی ایسی قبر موجود نہیں تھی جس پر دعا کے لیے لوگ آیا کرتے ہوں بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے زمانے میں سرے سے یہ فعل موجود ہی نہیں تھا۔ پھر امام شافعی رحمہ اللہ نے حجاز، یمن، شام، عراق اور مصر وغیرہ میں انبیاء علیہم السلام صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی بکثرت قبریں دیکھیں جن میں سے ہر ایک خود ان کے نزدیک اور تمام مسلمانوں کے نزدیک امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم عصر علماء سے کہیں افضل تھا مگر امام شافعی رحمہ اللہ نے کبھی کسی کی قبر کی طرف رجوع نہیں کیا۔ اور رجوع کیا بھی تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی قبر کی طرف، اور باقی کو کیوں چھوڑا؟ پھر خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے اصحاب مثلاً ابو یوسف، محمد، زفر، حسن بن زیاد وغیرہم رحمہم اللہ نے، جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو دیکھ چکے تھے اور ان کے مرتبے سے واقف تھے، کبھی ان کی قبر یا کسی اور کی قبر کی طرف رجوع نہیں کیا۔

پھر خود امام شافعی رحمہ اللہ نے جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، اپنی کتاب میں قبروں کی تعظیم مکروہ قرار دی ہے تاکہ جہلاء فتنے میں نہ پڑ جائیں۔ دراصل اس قسم کی روایتیں وہ لوگ تراشتے ہیں

جو بے دینی کے ساتھ ساتھ جہل کی مصیبت میں بھی مبتلا ہیں۔

مجہول الحال لوگوں کے اقوال

مجہول الحال لوگوں سے بھی اس قسم کے اقوال منسوب کر دیے جاتے ہیں، حالانکہ یہ مجہول الحال لوگ اگر خود نبیٔ معصوم علیہ السلام سے بھی ایسی باتیں روایت کریں تو ہمارے لیے ان کو قبول کرنا اس وقت تک روا نہیں جب تک روایت کرنے والے کی صحت ثابت نہ ہو جائے۔ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں صحت کا اس درجہ اہتمام کیا جاتا ہے تو پھر ہر کس و ناکس کس گنتی میں ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شخص نے اس قسم کی کوئی بات کہی یا کوئی ایسا کام کیا تھا مگر محض اجتہاد کی راہ سے، جو غلط بھی ہوسکتا ہے اور صحیح بھی، یا اسے بھی بہت سی قیود اور شرطوں سے اس طرح مشروط کر دیا تھا کہ وہ جائز ہوسکتی ہے لیکن روایت کرنے میں راوی دانستہ یا نادانستہ تحریف کر گئے ہیں، چنانچہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے ساتھ یہی معاملہ پیش آچکا ہے کہ آپ نے ممانعت کے بعد قبروں کی زیارت کی اجازت دی تا کہ عبرت حاصل ہو مگر گمراہوں نے اس سے اپنی ایجاد کردہ زیارت سمجھ لی جس میں قبروں کے پاس نماز پڑھی جاتی ہے، قبروں والوں سے دعائیں کی جاتی اور منتیں مانی جاتی ہیں حالانکہ اس زیارت کا مسنون زیارت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

قبر پرستوں کی تمام حجتیں اسی قسم کی ہیں۔ ان کا دارو مدار یا تو ایسی روایتوں پر ہے جن سے شریعت میں کوئی حکم ثابت نہیں ہوسکتا یا ایسے قیاسات پر ہے جو کسی فعل کو مستحب عبادت قرار نہیں دے سکتے۔ یہ مسلمانوں کا طریقہ نہیں ہے۔ اس طرح کی واہی اور نہایت کمزور حکایتوں اور قیاسوں سے عیسائی اپنی عبادتیں سنوارتے ہیں۔ مسلمانوں کے یہاں تو کوئی بات بھی اس وقت تک شرعی حکم نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا سابقین اولین

کے منہج سے ثابت نہ ہو جائے۔

مجمل اور مفصل جواب

قبر پرستوں کے استدلال کا جواب دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔

مجمل جواب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی اس قسم کی بہت سی کہانیاں مشہور ہیں بلکہ مشرکین عرب بھی، جن کی ہدایت کے لیے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تھے، اپنے بتوں کے سامنے دعائیں کرتے تھے اور ان کی دعائیں کبھی قبول ہو جایا کرتی تھیں۔ جس طرح کہ ان قبر پرستوں کی بھی بعض دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ پھر خود ہمارے زمانے میں نصاریٰ اور کفار و مشرکین کے ہاں بکثرت ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ پس اگر محض یہ بات اس فعل کے جواز اور اللہ کی نظر میں اس کے پسندیدہ و مستحسن ہونے کا ثبوت ہو تو پھر دنیا میں کسی دلیل و حجت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ کفر و اسلام کا فرق اٹھ جاتا ہے، حالانکہ اس منطق کو خود قبر پرست بھی تسلیم نہیں کریں گے۔

آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر لوگ قبروں کے پاس فریاد کرتے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے قبر والے کے ساتھ حسن ظن رکھا ہوا ہے اور دوسرے کے بارے میں برا گمان ہے۔ اور ایسے تمام لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس کی قبر کے پاس تو دعا قبول ہوتی ہے اور دوسرے کے پاس نہیں۔ اب یہ بات محال ہے کہ ان تمام کا خیال درست ہو۔ اگر ایک کی بات درست ہو تو پھر دوسرے کی غلط ہو جائے گی۔ کسی شخص کی کسی جگہ پر دعا کا قبول ہو جانا اس پر دلالت نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص اور اس جگہ سے محبت کرتا ہو اور اس پر راضی ہو، دیکھیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے بلعم بن باعوراء کی دعا قبول ہوئی تھی، حالانکہ وہ کافر تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس سے ایمان چھین لیا تھا، اسی طرح بسا اوقات مکے کے مشرک بتوں کے پاس بارش

اور فتح کی دعا مانگتے تھے اور وہ قبول ہو جاتی تھی۔

مفصل جواب یہ ہے کہ قبر پرستوں کا دعویٰ دو قسم کے دلائل پر قائم ہے: نقلی اور عقلی۔ ایک طرف وہ اپنے فعل کی تائید میں بعض اکابر کے اقوال وافعال روایت کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کی تائید میں تجربے اور قیاسی دلیلیں پیش کرتے ہیں، لیکن یہ دونوں قسم کی دلیلیں سراسر بے بنیاد ہیں جیسا کہ آئندہ ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس بارے میں قبر پرست جو کچھ نقلی دلائل روایت کرتے ہیں، وہ سرتاپا جھوٹ ہیں اور اگر صحیح مان لیے جائیں تو بھی شریعت میں حجت نہیں ہوسکتے۔ پھر ہم اس دعوے کے خلاف مستند طریقے پر ان اکابر ائمہ کے اقوال وافعال پیش کر چکے ہیں اور مزید بھی پیش کر سکتے ہیں جن کو مقتدیٰ، رہنما اور پیشوا مانا جاتا ہے۔

عقلی دلائل کی حقیقت

اب عقلی دلائل کی حقیقت دیکھیں، قبروں پر دعائیں قبول ہونے کے جتنے دعوے کیے جاتے ہیں اور جتنے فائدے بیان کیے جاتے ہیں وہ عام طور پر جھوٹے ہیں۔ کبھی کبھار شاذ ونادر طور پر کسی کی دعا یا مراد پوری ہو جاتی ہے مگر وہ اس لیے پوری نہیں ہوتی کہ قبر کی برکت کو اس میں دخل ہوتا ہے بلکہ اس کے بہت سے دوسرے اسباب ہوسکتے ہیں۔ اس کے برعکس براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والوں کے کام زیادہ بنتے ہیں، بلکہ اگر اسی جوشِ عقیدت اور طلبِ صادق کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے جو قبروں اور بتوں پر ضائع کی جاتی ہے تو شاذ ونادر ہی وقتی ناکامی ہو اور عارضی طور پر کام بنتا نظر نہ آئے اور وہ بھی کسی خاص سبب یا مصلحت سے ہوتا ہے۔ اخلاص کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے والوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب بندہ اللہ تعالیٰ سے ایسے دعا کرتا ہے جس میں گناہ اور

رشتہ داروں سے قطع رحمی کی دعا نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے تین باتوں میں سے کوئی ایک ضرور عطا فرماتا ہے: یا تو جلد ہی اس کی دعا قبول کر لیتا ہے، یا ویسی ہی کوئی دوسری بھلائی اس کے لیے جمع کر لیتا ہے یا اس کی مثل کوئی برائی اس سے دور کر دیتا ہے۔'' یہ سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ پھر ہم بے شمار دعائیں شروع کر دیں گے۔ آپ نے جواب دیا: ''تم کتنی ہی زیادہ دعائیں کرو، اللہ تعالیٰ کی بخشش کم نہیں ہو سکتی۔''[1] لہٰذا اللہ سے التجا کرنے والے بہر حال فائدے ہی میں رہتے ہیں، لیکن یہ قبر پرست مراد بر آنے پر بھی نقصان ہی اٹھاتے ہیں کیونکہ وہ توحید کی نعمت سے دور ہو جاتے ہیں، پروردگار کی رحمت میں ان کا حصہ کم ہو جاتا ہے اور دل کو ایمان کی وہ حلاوت نہیں ملتی جو مومنین صادقین کے حصے میں آتی ہے اور جو دنیا میں نعمت عظمیٰ اور آخرت میں سعادت ابدی کا ذریعہ ہے بلکہ یہ بھی بعید نہیں کہ ان نافرمانی کے کاموں سے برکت اٹھ جائے، اِلّا یہ کہ اللہ انھیں اس بنا پر معاف کر دے کہ وہ جاہل تھے اور نہیں جانتے تھے کہ بدعت اور معصیت کے کام کر رہے ہیں اور اجتہاد کرنے والے کو غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے اور غلطی معاف ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ اجتہاد کا اہل ہو، نہ کہ آباء و اجداد کی پیروی کرنے والا۔

حرام اعمال

یہی حال ان تمام اعمال کا ہے جنھیں مفید سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً علم نجوم، فال، نظر بندی، جھاڑ پھونک، جادو، ٹونے ٹوٹکے اور جنتر منتر وغیرہ۔ تو ان کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہے، بلکہ خود جس غرض کے لیے یہ چیزیں کی جاتی ہیں، اس کی بھلائی بھی کم یا دور ہو جاتی ہے۔ ان چیزوں سے عموماً دنیاوی فائدوں کا حصول ہی مقصود ہوتا ہے۔ اگر کبھی کوئی مراد ان ذرائع سے

[1] جامع الترمذي، الدعوات، باب في انتظار الفرج وغير ذلك، حديث:3573 و مسند أحمد: 329/5۔ یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔

پوری ہوجاتی ہے تو اکثر نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو اسی دنیا میں اس سے نقصان اٹھانا اور اس پر افسوس بھی کرنا پڑتا ہے اور اس کے بدترین انجام سے دوچار بھی ہونا پڑتا ہے، آخرت کی بربادی کا تو ذکر ہی کیا۔ پھر ان ناروا اور ناجائز ذرائع سے کام لینے والوں میں سے اکثر ناکام ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی کو اتفاق سے کامیابی حاصل ہو بھی جاتی ہے تو وہ کامیابی اپنے اندر بہت سی مضرتیں لے کر آتی ہے۔ یہ طریقہ اگر سودمند مان لیا جائے تو ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ طرح طرح کی بدنصیبیوں اور مضرتوں سے لبریز ہے۔

حکم کے مطابق مراد حاصل کرنے کا طریقہ

یہ انسان کی نادانی ہے کہ اس طرح کے نقصان دہ اور مضر طریقے اختیار کرتا ہے حالانکہ ایسے مشروع اسباب موجود ہیں جن سے دنیا و آخرت کی تمام جائز ومباح مرادیں حاصل کی جاسکتی ہیں، خواہ طبعی اسباب ہوں جیسے تجارت و زراعت وغیرہ، یا دینی اسباب ہوں مثلاً اللہ پر توکل کرنا، مشروع طریقوں سے رسول اللہ ﷺ کے کلمات ماثورہ کے ساتھ دعا کرنا، فضیلت والے وقتوں اور جگہوں میں اللہ کو پکارنا، صدقہ دینا، نیکی کرنا وغیرہ۔ ان ذرائع سے ہر نیکی و بھلائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس بات کی صحت پر کتاب وسنت اور اجماعِ امت سب متفق ہیں، نیز بے شمار تجربوں اور صحیح عقلی دلیلوں سے بھی اس کی قطعیت ثابت ہے۔ اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ نماز اور زکاۃ سے دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں حاصل ہوتی ہیں، ہر بھلائی آتی ہے اور ہر برائی اور خرابی دور ہوجاتی ہے۔[1]

---

[1] لیکن کیا اس وقت بھی نماز، روزہ اور حج وغیرہ عبادات سے مسلمانوں کو اس طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ بالکل نہیں، وجہ یہ ہے کہ جس عبادت کبریٰ کے لیے نفس کو تیار کرنے کے لیے جملہ عبادتیں مشروع ◂◂

اس بیان سے مطلوب یہ ہے کہ حرام وسائل واسباب سے کوئی حقیقی بھلائی حاصل نہیں ہوتی بلکہ سراسر برائی ہی برائی پیدا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی کوتاہ بین اور کم نظر شخص کسی کام میں اپنے لیے کوئی بھلائی تصور کرتا ہے تو وہ اپنے فعل پر خوش ہو جاتا ہے، لیکن جلد ہی حقیقت واضح ہونے پر حسرت وافسوس سے اسے ہاتھ ملنا پڑتے ہیں۔

یہ بات اتنی صاف اور واضح ہے کہ جو شخص بھی دنیا کے حالات کا کچھ علم اور سر میں ذرا بھی عقل رکھتا ہو تو وہ اسے فوراً تسلیم کر لے گا۔

اگر یہ سچ ہے تو پھر کسی ناجائز عمل کا کوئی ظاہری فائدہ ہمارے یقین کو متزلزل نہیں کر سکتا کیونکہ جن اسباب سے اللہ تعالیٰ آسمان وزمین میں حادثے پیدا کرتا ہے وہ بے شمار ہیں اور ہرگز مخلوق کے علم وحساب میں نہیں آسکتے، اس لیے کہ اس ذات برتر کی بادشاہت وملکیت وسیع ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور فلسفیوں کے طریقے

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ طریقہ تھا کہ وہ مخلوق کو اسی بات کا حکم دیتے تھے جس میں

◄◄ کی گئی ہیں، مسلمان اس خیال سے بھی دست بردار ہو گئے ہیں۔ وہ عبادت کبریٰ، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی راہ میں جان کی قربانی دینا۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک کر دو گے (جو جہاد کی پہلی منزل ہے) تو تمھاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔(جامع الترمذی، الفتن،باب ماجاء فی الأمر بالمعروف والنھی عن المنکر، حدیث:2169) اس کی سند صحیح ہے۔ آج یہ حالت ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔(جامع الترمذی، الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، حدیث: 3371) اس کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہے۔ اور نماز سراسر دعا ہی ہے۔ آج مسلمان اس حال میں ہو گئے ہیں کہ ان کی دعائیں اور عبادتیں مقبول نہیں ہوتیں۔ جب تک ان میں جذبۂ جہاد بیدار نہ ہوگا، یہی حالت رہے گی۔

اس کی بھلائی ہوتی تھی اور اس بات سے منع کرتے تھے جس میں اس کی برائی ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کے دماغ اور اسباب، کائنات کی بحث وتفکر میں مشغول نہیں کرتے تھے۔ جبکہ فلسفیوں کا دستور اس کے برعکس ہے اور درحقیقت یہ بحث بہت طولانی، تھکا ڈالنے والی اور فائدے سے خالی ہے بلکہ الٹا مضرت کا موجب بھی ہوسکتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی ماہر طبیب کسی مریض کا معائنہ کرتا ہے، اس کی بیماری تشخیص کرلیتا ہے اور اسے بتادیتا ہے کہ یہ یہ دوا پینا اور فلاں فلاں چیز سے پرہیز کرنا۔ بیمار اس کی ہدایت پر عمل کرتا ہے اور تندرست ہوجاتا ہے۔ برخلاف اس کے نام نہاد فلسفیوں کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی نیم حکیم، جو مریض کو دیکھتا ہے اور اپنی قابلیت جتانے کے لیے مرض کی حقیقت اور اس کے اسباب کی تشریح شروع کردیتا ہے، بہت سی فضول باتیں کرجاتا ہے، لیکن جب بیمار اکتا کر پوچھتا ہے کہ حکیم صاحب مجھے وہ دوا بتایئے جس سے شفا حاصل ہو تو وہ بغلیں جھانکنے لگتا ہے اور دوا نہیں بتا سکتا۔

حرام دعائیں کیوں قبول ہوتی ہیں؟

بعض اسباب ایسے بھی ہیں کہ ان پر گفتگو اور بحث ضعیف العقل اور قلیل الایمان لوگوں کو فتنے میں ڈال سکتی ہے۔ عقل مند کے لیے اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ غیر مشروع اسباب ووسائل ہرگز مؤثر نہیں ہوتے اور اگر کبھی ان کا اثر ظاہر ہوتا ہے تو اس کا نقصان، نفع سے زیادہ ہوتا ہے۔ حرام دعاؤں پر بھروسا کرنے والوں کی بعض دعائیں کبھی صرف اس لیے قبول ہوجاتی ہیں کہ وہ سخت پریشان ہوتے ہیں اور پریشانی کی وجہ سے نہایت سچے دل سے دعا کرتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی دعا مشرک بھی اپنے بت کے سامنے کرے تو شرک ہونے کے باوجود قبول ہوجائے کیونکہ اس حالت میں اللہ کی طرف سچی توجہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کبھی قبر کے توسل سے سچی توجہ کی حالت میں کی جانے والی دعا قبول ہوسکتی ہے، مگر اس شرک

کی وجہ سے دعا کرنے والا دوزخ میں ڈالا جائے گا، اِلّا یہ کہ اللہ اسے معاف کردے۔

ایسے آدمی کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے کوئی شخص کوئی ایسی چیز طلب کرتا ہے جس میں اس کے لیے فتنہ ہے، جس طرح کہ ثعلبہ نے نبیٔ کریم ﷺ سے دخواست کی تھی کہ اس کے حق میں مال اوراولاد کی فراوانی کے لیے دعا کریں۔ آپ نے کئی بار منع کیا کہ یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے، تجھے نقصان پہنچے گا مگر وہ ضد ہی کرتا رہا۔ مجبوراً آپ نے دعا کردی اور اللہ نے قبول فرمالی، شروع شروع میں وہ بہت خوش ہوا مگر بعد میں وہی چیز دنیا و آخرت میں اس کی بدبختی کا سبب بن گئی۔ [1]

نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''آدمی مجھ سے آکر مانگتا ہے اور میں اسے دے دیتا ہوں مگر حقیقت میں وہ اپنی بغل میں دوزخ کی آگ دبا کر واپس جاتا ہے۔'' صحابہ نے عرض کیا کہ پھر آپ کیوں عطا کرتے ہیں؟ فرمایا: ''یہ لوگ مانگے بغیر رہ نہیں سکتے اور اللہ تعالیٰ نے میری طبیعت ایسی بنائی ہے کہ میں بخل کر نہیں سکتا۔'' [2]

دعا کا صحیح طریقہ

اسی طرح بہت سے لوگ غلط دعائیں کرتے ہیں اور وہ قبول کر لی جاتی ہیں، لیکن ساتھ ہی

---

① حضرت ثعلبہ بن حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہما کا یہ جو مشہور قصہ ہے یہ سند کے لحاظ سے درست ہے نہ متن کے اعتبار سے۔ کیونکہ اس کی تین سندیں ہیں اور وہ نہایت کمزور اور واہی ہیں اور متن کے لحاظ سے بھی یہ ناقابل قبول ہے اوراس کے چھ جوابات دیے گئے ہیں، جن کو سلیم ہلالی نے اپنے رسالے ''الشهاب الثاقب فى الذب عن الصحابى الجليل ثعلبة بن حاطب رضی اللہ عنہ'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نیز حضرت ثعلبہ بن حاطب رضی اللہ عنہ بدری صحابی ہے اور بدری صحابۂ کرام کی فلاح اور فضیلت کا کوئی بھی منکر نہیں۔ بہرحال اس رسالے کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

② مسند أحمد: 164/3۔ اس کی سند صحیح ہے۔

ان کی دنیا وآخرت برباد ہو جاتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ ٱدۡعُواْ رَبَّكُمۡ تَضَرُّعٗا وَخُفۡيَةًۚ إِنَّهُۥ لَا يُحِبُّ ٱلۡمُعۡتَدِينَ ﴾ (55)

''پکارو اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور چپکے چپکے سے، یقیناً وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''[1]

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعا میں بے اعتدالی اور حد سے تجاوز کو پسند نہیں کرتا، نہ دعا کی کیفیت میں اور نہ دعا کے مطلوب میں، لیکن بے اعتدالوں کی دعائیں بھی کبھی قبول کر لیتا ہے مگر وہ ان کے حق میں فتنے کا سامان ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو فتنے میں نہیں ڈالنا چاہتا مگر وہ خود ہی اس قسم کی دعا کر کے فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

جادو سے مرادیں بر آنا

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جادو، طلسمات اور نظر بندی کے ذریعے سے بھی اللہ تعالیٰ بہت سے شریر لوگوں کی مرادیں پوری کر دیتا ہے، جیسا کہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہے مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا ہے:

﴿ وَلَقَدۡ عَلِمُواْ لَمَنِ ٱشۡتَرَىٰهُ مَا لَهُۥ فِي ٱلۡأٓخِرَةِ مِنۡ خَلَٰقٖۚ وَلَبِئۡسَ مَا شَرَوۡاْ بِهِۦٓ أَنفُسَهُمۡۚ لَوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ (102) وَلَوۡ أَنَّهُمۡ ءَامَنُواْ وَٱتَّقَوۡاْ لَمَثُوبَةٞ مِّنۡ عِندِ ٱللَّهِ خَيۡرٞۚ لَّوۡ كَانُواْ يَعۡلَمُونَ ﴾ (103)

''اور وہ یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں۔ کاش کہ یہ جانتے ہوتے! اگر یہ لوگ صاحب ایمان، متقی بن جاتے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

---

[1] الأعراف 7:55

انھیں بہترین ثواب ملتا، اگر یہ جانتے ہوتے۔''[1]

یہ افعال کرنے والے خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ وہ گناہ گار ہیں اور آخرت میں نقصان اٹھائیں گے، لیکن صرف دنیاوی منفعت کے لیے یہ مضرت رساں اور نقصان دہ کام کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق انھیں دنیا میں بھی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ نقصان ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بہت سے دعا کرنے والوں کا بھی یہی حال ہے، وہ کبھی حرام یا مکروہ دعا کرتے ہیں اور ان کی مراد پوری ہو جاتی ہے مگر ساتھ ہی انھیں بہت زیادہ نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے۔

عالم و جاہل

تحریم و کراہت کے ان مراتب سے کبھی دعا کرنے والا واقف ہوتا ہے اور کبھی واقف نہیں ہوتا۔ ناواقفیت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں: ایسی ناواقفیت جو معاف نہیں کی جا سکتی جیسے اس نے تحصیل علم میں کوتاہی کی ہو، یا حق سے بے پرواہی برتی ہو، اور دوسری وہ ناواقفیت جو معاف ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ اس درجے کا مقلد یا مجتہد ہو جو تمام اعمال میں معذور سمجھا جا سکتا ہے، غیر معذور کو بھی ایسی ناروا دعا کے معاملے میں، اس کی بکثرت نیکیوں کی وجہ سے یا محض اپنی رحمت یا ایسے ہی کسی سبب سے، اللہ معاف کر دیتا ہے۔

دعا اور عبادت کا معاملہ

دعا کا معاملہ بھی دوسری تمام عبادات کی طرح ہے اور عبادت کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے کہ اگر عبادت میں کوئی کراہت موجود ہو تو وہ کراہت آدمی کو اس کے اجتہاد، تقلید، حسنات،

---

[1] البقرۃ 2:102-103

یا کسی اور سبب سے اللہ کے ہاں معاف ہوسکتی ہے مگر اس عفو و بخشش سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس عبادت کو مکروہ بھی قرار نہ دیا جائے۔

سخت ٹھوکر کا مقام

بہت سے لوگوں کو یہی ٹھوکر لگی ہے، وہ سنتے ہیں کہ کسی بزرگ نے کوئی خاص عبادت کی یا کوئی خاص دعا مانگی اور اس عبادت اور دعا سے اسے کوئی فائدہ حاصل ہوگیا۔ بس اتنا سنتے ہی یہ لوگ آگے بڑھتے ہیں اور بزرگوں کے فعل کو اس عبادت اور دعا کے مستحسن و محمود اور قابل تعریف ہونے کا ثبوت قرار دے دیتے ہیں اور پھر اسے ایک ایسی سنت بنا لیتے ہیں گویا کسی پیغمبر کا عمل ہو۔ حالانکہ یہ سخت غلطی ہے جیسا کہ ہم پیچھے واضح کر چکے ہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اس خاص عمل کا اثر اس کی سچی توجہ اور نیک نیتی کی وجہ سے پیدا ہوا ہو۔ اگر وہی عمل بعد میں اس کے پیروکار محض تقلید کی بنا پر کریں گے، اس سچائی اور اخلاص کی طرف توجہ نہیں دیں گے تو انھیں اس سے نفع کے بجائے نقصان پہنچے گا کیونکہ وہ عمل اپنی جگہ پر ناجائز ہے اور معلوم ہے کہ ناروا اور ناجائز عمل کا نہ کوئی ثواب مقلدوں کو حاصل ہوسکتا ہے اور نہ اس کا کوئی اثر ہی ظاہر ہوسکتا ہے کیونکہ اس بزرگ کی نیک نیتی ان لوگوں میں مفقود ہے، اور یہی نیک نیتی اس بزرگ کے سلسلے میں ممکن ہے کہ اس کی غلطی کا کفارہ ہوگئی ہو۔

حال اور وجد

اسی قبیل سے یہ آثار بھی ہیں جو بعض شیوخ کی نسبت بیان کیے جاتے ہیں کہ بدعتی سماع کے دوران ان پر طاری ہوئے تھے۔ اگر یہ روایتیں صحیح مان لی جائیں تو یہ آثار صرف ان احوال کا نتیجہ ہوں گے جو ان لوگوں کے دلوں میں قائم تھے۔ ان احوال کو اس شخص نے حرکت دے دی تھی جس کے سماع میں وہ حاضر تھے۔ ان کا فعل یا تو اجتہاد کی راہ میں سے تھا، یا استقامت میں کمزوری کی وجہ سے، جو ان کے حسن قصد میں محو ہوگئی۔ اب اگر ان کی دیکھا دیکھی لوگ سماع کی مجلسوں میں جانے لگیں اور ان کی پیروی کا دعویٰ کریں تو ان کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ ان شیوخ کا وہ فعل نہ تو سنت بن سکتا ہے اور نہ ان مقلدوں میں ان جیسا حسن قصد موجود ہے، اس لیے یہ ان کی ہلاکتِ ایمان کا سبب بن جائے گا۔

ایک بزرگ کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ موت کے بعد وہ خواب میں دکھائی دیا۔ پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تم سے کیا برتاؤ کیا؟ اس نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے اپنے حضور مجھے کھڑا کیا اور غصے سے فرمایا: اے بدکردار شیخ! تو ہی سُعدی اور لُبنی [1] کے اشعار سن کر وجد کیا کرتا تھا۔ اگر میرے علم میں تو نیک نیت نہ ہوتا تو یقیناً تجھے عذاب میں گرفتار کر دیتا۔

---

[1] عرب محبوباؤں کے نام۔

سحنون محبؒ

سحنون محبؒ کی بابت کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بیان کیا: ایک دن میرے دل میں کچھ شک پڑ گیا۔ میں ایک سوکھے درخت کے پاس گیا اور کہنے لگا: یااللہ! تیرے جلال کی قسم! میں اس وقت تک نہیں ٹلوں گا، جب تک یہاں سے مچھلی نہ نکل آئے۔ چنانچہ ایک عظیم الشان مچھلی نکل آئی۔ راوی کہتا ہے کہ جنید بغدادی رحمہ اللہ نے یہ سنا تو کہنے لگے: کاش! مچھلی کی جگہ سانپ نکلتا اور اسے ڈس لیتا۔

اسی طرح میں نے سنا ہے کہ مدینے کا ایک مجاور قبر نبوی پر حاضر ہوا اور لذیذ کھانا کھانے کی خواہش کی۔ ایک ہاشمی کھانا لے کر آیا اور کہنے لگا کہ یہ نبی کریم ﷺ نے بھیجا ہے اور فرمایا کہ تو ہمارے پاس سے چلا جا کیونکہ جو ہمارے پاس ہوتا ہے، اسے ایسے کھانوں کی خواہش نہیں ہوتی۔

بعض لوگوں کی مرادیں پوری ہوجاتی ہیں اور ان پر اس طرح کا اعتراض نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ یا تو مجتہد ہوتے ہیں یا قابل معافی تقلید میں پھنسے ہوتے ہیں، یا کم علمی ان کی سفارش کرتی ہے اس لیے کہ جاہل کی وہ باتیں معاف کی جاسکتی ہیں، جو عالم لوگوں کے لیے معاف نہیں ہوں گی۔

کم علموں کے اعمال

اس بارے میں جتنے بھی واقعات بیان کیے جاتے ہیں، تمام تر کم علموں کے واقعات ہیں حالانکہ اگر یہ چیز شریعت اور دین میں داخل ہوتی تو اہلِ علم اس سے ضرور واقف ہوتے اور اس پر عمل کرنے میں سب سے آگے نظر آتے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ چونکہ یہ سب لوگ بے علم تھے، اس لیے ان کے لیے ایسی باتیں روا تھیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں کسی بشر کے لیے روانہیں رکھیں۔ ہاں! زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لیے کم علمی کی حالت میں عفو ومغفرت کی امید کی جاسکتی ہے، لیکن مکروہات کو مستحب سمجھنا اور محرمات کو حلال جاننا کسی حال میں بھی معاف نہیں ہوگا۔ لہٰذا دونوں باتوں میں فرق ضرور رکھو۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی شخص کو اس کا ناروا فعل بخش دیا جائے اور دوسرا یہ ہے کہ اس کے فعل کو جائز سمجھا جائے یا اس کے فعل کو پسند کیا جائے۔ پہلی بات تو درست ہوسکتی ہے لیکن دوسری بات بالکل غلط ہے۔ لہٰذا اگر یہ سنیں کہ پیغمبر یا بزرگ کی قبر پر دعا مانگنے سے کسی کی مراد پوری ہوگئی تو اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ وہ فعل مستحسن اور قابل مدح ہے۔

کسی شخصیت کے اقوال وافعال، سنت وشریعت نہیں ہیں کہ ان کی بے چون وچرا پیروی کی جائے۔ یاد رکھیں کوئی بات بھی اس وقت تک مستحب قرار نہیں پاسکتی اور نہ دین بن سکتی ہے جب تک کہ وہ کتاب وسنت اور السابقون الاولون کے عمل سے ثابت نہ ہوجائے اور کوئی بھی بدعت مستحسن قرار نہیں دی جاسکتی، اگرچہ کبھی اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہو کیونکہ ہمیں یقین سے معلوم ہوچکا ہے کہ اس کے نقصانات اس کی منفعتوں اور فوائد سے زیادہ ہیں۔

دعا میں تحریم وکراہت

پھر دعا سے متعلق یہ تحریم وکراہت یا تو ناروا مطلوب کی وجہ سے ہوتی ہے یا خود طلب کی وجہ سے۔ حرام مطلوب کی مثال یہ ہے کہ آدمی دانستہ یا نادانستہ ایسی ایسی دعا مانگے جو اسے دنیا یا آخرت میں نقصان پہنچانے والی ہے اور وہ قبول ہوجائے جیسا کہ اس شخص کا حال ہوا جس کی عیادت کے لیے نبی اکرم ﷺ تشریف لے گئے تو اسے چوزے کی طرح سکڑا ہوا پایا، آپ

نے پوچھا کہ کیا تو کوئی دعا کیا کرتا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ جی ہاں! میں دعا کیا کرتا تھا کہ یااللہ العالمین! آخرت میں جو سزا تو مجھے دینے والا ہے وہ اسی دنیا میں دے دے۔ اس پر آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! تجھ میں اس قدر قدرت نہ تھی، تو نے یہ دعا کیوں نہ کی:[1]

﴿رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِى ٱلْـَٔاخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ ٱلنَّارِ ﴿٢٠١﴾﴾

''ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔''[2]

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا جو صرف دنیا کی طلب میں دعا کرتے ہیں:

﴿فَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَآ ءَاتِنَا فِى ٱلدُّنْيَا وَمَا لَهُۥ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ مِنْ خَلَـٰقٍ ﴿٢٠٠﴾﴾

''بعض ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں عطا کر اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔''[3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمادی ہے کہ جو شخص صرف دنیا طلب کرتا ہے، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔

اہل وعیال کی بددعائیں

کسی کو بددعا دینے کے گناہ میں بہت سے اہلِ دل مبتلا ہوجایا کرتے ہیں۔ ان پر کسی شخص

---

[1] صحیح مسلم، الذکر والدعاء، باب کراھة الدعاء بتعجیل العقوبة فی الدنیا، حدیث:2688

[2] البقرة 201:2 [3] البقرة 200:2

کی محبت یا عداوت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ ایسی دعا یا بددعا کر دیتے ہیں جو روا نہیں ہوتی۔ ان کی دعا کبھی قبول ہو جاتی ہے اور وہ اپنی انھی دعاؤں کی وجہ سے سزا کے مستحق بن جاتے ہیں، جس طرح کہ دوسرے گناہوں پر بھی وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اگر وہ توبہ نہ کریں، یا گناہ کے کاموں کو ختم کر دینے والی حسنات کے مالک نہ ہوں، یا ایسا ہی کوئی اور سبب موجود نہ ہو تو انھیں اس طرح سزا مل سکتی ہے کہ ایمان کی لذت ان سے چھین لی جاتی ہے اور وہ اس کی حلاوت سے محروم ہو کر اپنے درجے سے گر جاتے ہیں، یا ایمان کا عمل ان سے سلب کر لیا جاتا ہے اور وہ فاسق بن جاتے ہیں، یا خود ایمان کی بنیاد ہی ان کے دلوں سے نکال لی جاتی ہے اور وہ نفاق کے ساتھ کفر میں داخل ہو جاتے ہیں، یا بغیر نفاق کے کافر بن جاتے ہیں۔

اس طرح کی مصیبت میں بعض اہل دل اپنے باطنی احوال میں بصیرت نہ رکھنے اور قلبی اعمال میں شریعت الٰہی سے جاہل ہونے کی بنا پر اس میں زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی اہل دل کا حال اس درجہ غالب ہوتا ہے کہ اسے اس طرف سے ہٹایا ہی نہیں جا سکتا جدھر وہ متوجہ ہو چکا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی دعا اس طرح جا کر لگتی ہے جیسے کمان سے نکلا ہوا تیر۔ یہ غلبہ اکثر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ احوال قلب کی حفاظت کرنے والے مشروع اعمال میں کوتاہی کی جاتی ہے اور ایسا شخص قابل مواخذہ ہو جاتا ہے۔ اور کبھی اس طرح کی بات غلط اجتہاد کی بنا پر ہوتی ہے، اس لیے معاف کر دی جاتی ہے۔

کرامت

پھر یہ لوگ اور ان کے ہم مشرب، اس طرح کی دعاؤں پر مغرور ہو کر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرامتیں ہیں۔ حالانکہ وہ کرامتیں نہیں ہوتیں البتہ اس لحاظ سے وہ

کرامات کے مشابہ ضرور ہیں کہ تیر بہدف ہوتی ہیں، لیکن حقیقی کرامت وہ ہے جو آخرت میں نفع پہنچائے یا آخرت کو نقصان پہنچائے بغیر دنیا میں مفید ہو۔ قبول ہوجانے والی ناجائز دعائیں ویسے ہی نعمتیں ہیں جیسے کہ کفار وفساق کو دنیا میں دولت وسرداری کی نعمت مل جاتی ہے، لیکن یہ ان کے لیے آخرت میں کارآمد نہیں ہوگی۔ اور معلوم ہے کہ دولت وسرداری اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جب کہ آخرت کو بگاڑنے والی نہ ہوں۔ اسی لیے علماء میں یہ بحث مدت سے چلی آرہی ہے کہ کفار کی دنیاوی ترقی اللہ کی نعمت ہے یا نہیں، لیکن یہ بحث سراسر لفظی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِۦ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِى ٱلْخَيْرَٰتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾﴾

''کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم جو ان کے مال واولاد بڑھارہے ہیں، وہ ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں۔ نہیں نہیں، بلکہ یہ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔''[1]

اور فرمایا:

﴿فَلَمَّا نَسُوا۟ مَا ذُكِّرُوا۟ بِهِۦ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَٰبَ كُلِّ شَىْءٍ حَتَّىٰٓ إِذَا فَرِحُوا۟ بِمَآ أُوتُوٓا۟ أَخَذْنَٰهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾﴾

''پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھول گئے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر، جو کہ ان کو ملی تھیں، وہ خوب اِترا گئے تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا پھر وہ بالکل ناامید ہوکر رہ گئے۔''[2]

اور حدیث میں ہے، جب دیکھو کہ گناہ پر اصرار کرنے والے بندے پر اللہ کی نعمتیں نازل ہوتی چلی جاتی ہیں تو سمجھ لو کہ اللہ اپنی رسی ڈھیلی کر رہا ہے۔[3]

---

① المؤمنون 23:55-56 ② الأنعام 6:44

③ مسند أحمد: 4/145۔ اس کی سند صحیح ہے۔

غیر اللہ سے دعا

رہ گئی طلب کی وجہ سے حرمت تو وہ کبھی اس لیے ہوتی ہے کہ دعا غیر اللہ سے کی گئی ہے۔ جیسے ساحر اور جادوگر لوگ ستاروں کی عبادت ومخاطبت کو ذریعہ بنا کر دعا کرتے ہیں۔ اس طرح کی بھی بہت سی دعائیں قبول ہو جاتی ہیں، بشرطیکہ اہل ایمان کا ایمان وعبادت یا ایسا ہی کوئی مانع پیش نہ آ جائے۔ یہی سبب ہے کہ اس طرح کی دعائیں زیادہ تر ایسے زمانے میں قبول ہوتی ہیں جو رسولوں کی بعثت کا زمانہ نہیں ہوتا اور ایسے ملکوں میں ہوتی ہیں جہاں کفر ونفاق کا غلبہ ہوتا ہے۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو مصیبت پیش آنے پر کسی زندہ آدمی کی دہائی دیتے ہیں اور مصیبت دور ہو جاتی ہے حالانکہ اس آدمی کو اس کی ذرا بھی خبر نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دوسروں کو بددعا دیتے یا ان کی ایذا ہی پر متوجہ ہوتے ہیں مگر کوئی زندہ یا مرا ہوا آدمی درمیان میں انھیں نظر آ جاتا ہے اور ان کا ارادہ پورا نہیں ہونے دیتا۔ ان لوگوں نے کبھی ایسا بھی دیکھا ہے کہ وہ مردہ یا زندہ آدمی تلوار ہاتھ میں لیے انھیں مارنے کو لپک رہا ہے حالانکہ خود اس زندہ آدمی کو اس کا مطلق علم نہیں ہوتا۔ دراصل یہ اللہ کی طرف سے کسی ایسے تعلق کی وجہ سے واقع ہوتا ہے جو مظلوم اور اسے بچانے والے کے مابین موجود ہوتا ہے۔ اور وہ تعلق یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پیروی کرتا اور حق میں اس کی اطاعت کرتا ہے۔

پس اگر اس طرح کا اثر اس شخص سے دعا کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے جسے اس دعا کی خبر تک نہیں تو ظاہر ہے یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اثر اسی شخص نے اپنی کرامت یا قوت سے پیدا کر دیا ہے۔ اگر کہا جائے کہ وہ اثر اللہ تعالیٰ نے اس بزرگ کی بزرگی یا طفیل میں پیدا کیا ہے تو اگر وہ دعا حرام طریقے پر مانگی گئی ہے تو وہ اثر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا کیوں کر روا ہو سکتا

ہے۔اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص زہر کھا لے اور زہر سے اس میں کوئی بیماری پیدا ہو جائے، تو ظاہر ہے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔

کبھی فی نفسہ حرام دعا، غیر اللہ کے لیے ہوتی ہے مثلاً عیسائیوں کی طرح دعا کی جائے، جو کہتے ہیں: اے اللہ تعالیٰ کی ماں! اللہ سے ہماری شفاعت کر۔کبھی دعا تو اللہ سے ہوتی ہے مگر درمیان میں ایسا وسیلہ پکڑ لیا جاتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہوتا ہے۔جیسے مشرکین اپنے بتوں کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دعا کرتے ہیں۔کبھی دعا ایسے الفاظ میں ہوتی ہے جو دعا کے لیے مناسب نہیں ہوتے۔

غرض اس قسم کی دعاؤں سے اگرچہ آدمی کا کام کبھی نکل جاتا ہے،مگر وہ دعائیں حرام ہی ہیں کیونکہ ان کی برائی، بھلائی سے زیادہ ہوتی ہے۔جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ دعائیں ان لوگوں کے حق میں فتنہ بن جاتی ہیں جنھیں اللہ نے اپنی جانب سے ہدایت نہیں بخشی اور جن کے دلوں پر اپنے نور کا جلوہ نہیں ڈالا کہ وہ امور تکوینی اور امور تشریعی کے درمیان فرق سمجھ لیتے۔

تقدیر وتشریع

تقدیر وتشریع میں فرق ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔معاملات تین قسم کے ہوتے ہیں:

① ایسے امور جنھیں اللہ تعالیٰ نے مقدر کر دیا ہے لیکن وہ انھیں پسند نہیں کرتا۔لہٰذا وہ تمام اسباب جو ان امور کا باعث ہوتے ہیں، حرام ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کے موجب ہوتے ہیں۔

② ایسے امور جو اللہ نے مشروع کیے ہیں اور وہ انھیں اپنے بندے سے پسند کرتا ہے لیکن ان کے حصول میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اعانت نہیں فرمائی، یہ امور ہر حال میں محمود و مستحسن

ہیں، اگرچہ ان پر عمل نہ کیا جائے۔

③ تیسری قسم ان محمود و مستحسن امور کی ہے جن کے حصول میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی اعانت بھی کرتا ہے۔

پہلی قسم، اعانت الٰہی سے متعلق ہے، دوسری اس کی عبادت سے اور تیسری میں بندے کے لیے عبادت اور اعانت دونوں جمع کر دی گئی ہیں اور یہی سب سے بڑی چیز ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو دعا سکھائی ہے کہ وہ کہیں: ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ پس اگر غیر مباح دعا اثر پیدا کر دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ باب اعانت سے ہے نہ کہ باب عبادت سے اور اس میں تمام کفار و فساق اور منافقین کی دعائیں بھی برابر ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کے متعلق فرمایا:

''اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی۔''[1]

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی رب کے کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کر سکتا۔[2]

---

① التحریم 66:12

② موطأ الإمام مالك، كتاب الجامع، باب مايؤمر به من التعوذ، حديث:116۔ اور اس کے الفاظ یوں ہیں: أَعُوْذُ بِوَجْهِ اللّٰهِ الْكَرِيْمِ وَبِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ اللَّاتِيْ لَا يُجَاوِزُ هُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ مِنْ شَرِّ مَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ۔ یعنی میں اللہ کے معزز چہرے کے ساتھ اور اس کے ان کامل کلمات کے ساتھ پناہ پکڑتا ہوں جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کر سکتا۔ میں اس چیز کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جو آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ یہ روایت مرسل ہے البتہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ''أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ۔'' یعنی میں اللہ کے کامل کلمات کے ساتھ اس چیز کے شر سے پناہ پکڑتا ہوں جسے اس نے پیدا کیا ہے۔ دیکھیے: صحيح مسلم، الذكر والدعاء، باب في التعوذ من سوء القضاء، حديث:2709

توحید کا ثبوت

اور یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مشرکانہ غلط دعاؤں سے بہت سی حقیر مرادیں تو حاصل ہو جاتی ہیں، لیکن بڑے بڑے حوادث میں یہ دعائیں مفید نہیں ہوتیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ أَرَءَيْتَكُمْ إِنْ أَتَىٰكُمْ عَذَابُ ٱللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ ٱلسَّاعَةُ أَغَيْرَ ٱللَّهِ تَدْعُونَ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٤٠﴾ بَلْ إِيَّاهُ تَدْعُونَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِن شَآءَ وَتَنسَوْنَ مَا تُشْرِكُونَ ﴿٤١﴾﴾

”آپ کہیے کہ اپنا حال تو بتلاؤ کہ اگر تم پر اللہ کا کوئی عذاب آپڑے یا تم پر قیامت ہی آ پہنچے تو کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر تم سچے ہو؟ بلکہ خاص اسی کو پکارو گے، پھر جس چیز کے لیے تم اسے پکارو گے اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا دے گا اور جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو ان سب کو بھول جاؤ گے۔“[1]

اور فرمایا:

﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ ٱلضُّرُّ فِى ٱلْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّآ إِيَّاهُ ۖ فَلَمَّا نَجَّىٰكُمْ إِلَى ٱلْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ ۚ وَكَانَ ٱلْإِنسَٰنُ كَفُورًا ﴿٦٧﴾﴾

”اور سمندر میں مصیبت پہنچتے ہی، جنھیں تم پکارتے تھے، سب گم ہو جاتے ہیں صرف وہی اللہ باقی رہ جاتا ہے۔ پھر جب وہ (اللہ) تمھیں خشکی کی طرف بچا لاتا ہے تو تم منہ پھیر لیتے ہو۔ انسان بڑا ہی ناشکرا ہے۔“[2]

---

[1] الأنعام 6:40-41 [2] الإسراء 17:67

اور فرمایا:

﴿أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٣﴾ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ﴾

”کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کو سفارشی مقرر کر رکھا ہے؟ آپ کہہ دیجیے کہ اگرچہ وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں، نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دیجیے! کہ ساری سفارش اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“[1]

چنانچہ حاجات اور مرادوں کا براہ راست صرف اللہ تعالیٰ کو پکارنے سے حاصل ہونا، اس کی توحید کو ثابت کرتا ہے اور شرک کے تمام شبہات کو دور کر دیتا ہے، نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان عظیم حوادث کے علاوہ جتنے امور اور معاملات ہوتے ہیں وہ بھی اللہ وحدہ لاشریک ہی کرتا ہے اگرچہ بظاہر یہ امور حرام یا حلال اسباب کے ذریعے سے واقع ہوں۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان، زمین، ہوائیں، بادل اور دوسری عظیم اجسام رکھنے والی مخلوقات پیدا کی ہیں، یہ تمام اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان سے کم درجے کی چیزیں تو بالاولی اسی کی قدرت وارادے سے پیدا ہوئی ہیں، یا اس کی مخلوق کسی چیز کو بنائے تو وہ بھی اللہ ہی کی مخلوق قرار پائے گی کیونکہ مخلوق کی تخلیق خود خالق اکبر کی مخلوق ہوتی ہے اور سبب کا خالق مسبب کا بھی خالق ہوتا ہے۔

---

[1] الزمر 39:43-44

فصل 12

شرک کی قسمیں

اس بارے میں اصل یہ ہے کہ شرک کی دو قسمیں ہیں:

① ربوبیّت میں شرک ② الوہیّت میں شرک۔

ربوبیّت میں شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کو اللہ کی تدبیر میں شریک بنا دیا جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قُلِ ٱدْعُوا۟ ٱلَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۖ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِى ٱلْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُۥ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ﴾

”کہہ دیجیے! کہ اللہ کے سوا جن جن کا تمھیں گمان ہے سب کو پکارو۔ وہ آسمانوں اور زمینوں میں ذرہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے، اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہی ہے۔“[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ معبودان باطلہ ذرہ برابر بھی استقلال اور خود مختاری نہیں رکھتے، نہ کسی چیز میں اس کے شریک ہیں، نہ کسی چیز میں اس کی مدد کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص نہ مالک ہے، نہ شریک ہے اور نہ مددگار ہے تو وہ بالکل بے تعلق ہے اور ہرگز کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

الوہیّت میں شرک یہ ہے کہ غیر اللہ کی عبادت کی جائے یا اس سے دعا مانگی جائے کیونکہ

---

① سبأ 22:34

عبادت ودعا کی سزاوار صرف وہی ایک ذات الٰہی ہے اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دعا سکھلائی کہ وہ کہیں:

﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ ﴾

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔''[1]

چنانچہ جس طرح بعض مخلوقات کا بعض چیزوں کو پیدا کر لینا توحید ربوبیّت کے منافی ہوسکتا ہے نہ اللہ کے خالق ہونے کے خلاف دلیل بن سکتا ہے اور نہ یہ بات ضروری ٹھہراتا ہے کہ کسی مخلوق کی عبادت کی جائے یا اس سے دعا واستغاثہ کیا جائے، اسی طرح بعض شرکیہ افعال سے کبھی کوئی فائدہ حاصل ہوجانا، توحید الوہیت کے خلاف دلیل نہیں ہوسکتا، نہ اس بات کی تردید کرسکتا ہے کہ اللہ ہی دین خالص کا مستحق ہے اور نہ یہ بات ضروری ٹھہراتا ہے کہ وہ الفاظ استعمال کیے جائیں اور وہ افعال اختیار کیے جائیں جن میں شرک ہے اور جن کے نقصانات بندے کے لیے ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہیں کیونکہ سراسر بھلائی صرف اسی جملے میں مضمر ہے۔ ﴿ إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ﴾ یعنی ہم صرف ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی اکیلے سے مدد چاہتے ہیں۔

قرآن کی اکثر وبیشتر آیات اسی اصل الاصول کو ثابت کر رہی ہیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے بلا اجازت شفاعت تک کی جڑ کاٹ دی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿مَن ذَا ٱلَّذِى يَشْفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذْنِهِۦ﴾

''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کرسکے؟''[2]

اور فرمایا:

---

[1] الفاتحة 5:1 [2] البقرة 255:2

﴿وَأَنذِرْ بِهِ ٱلَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوٓا۟ إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۙ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِۦ وَلِىٌّ وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٥١﴾﴾

''اور (اے نبی!) اس (قرآن) کے ذریعے سے ایسے لوگوں کو ڈرائیے جو اس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے، وہاں اللہ کے سوا کوئی ان کا مددگار ہوگا نہ کوئی شفیع ہوگا، شاید کہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔''[1]

اور فرمایا:

﴿وَذَكِّرْ بِهِۦٓ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلِىٌّ وَلَا شَفِيعٌ﴾

''اور آپ اس (قرآن) کے ذریعے سے نصیحت کرتے رہیں، تا کہ کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے سبب ہلاک نہ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی اس کا دوست اور سفارشی نہ ہو۔''[2]

اور فرمایا:

﴿قُلْ أَنَدْعُوا۟ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَنفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰٓ أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَىٰنَا ٱللَّهُ كَٱلَّذِى ٱسْتَهْوَتْهُ ٱلشَّيَـٰطِينُ فِى ٱلْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُۥٓ أَصْحَـٰبٌ يَدْعُونَهُۥٓ إِلَى ٱلْهُدَى ٱئْتِنَا ۗ قُلْ إِنَّ هُدَى ٱللَّهِ هُوَ ٱلْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ ٱلْعَـٰلَمِينَ ﴿٧١﴾﴾

''(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو ہمیں نہ نفع دے سکتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ اور جب اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھا چکا ہے تو کیا اس کے بعد ہم الٹے پاؤں پھر جائیں، اس شخص کی طرح جسے شیطانوں نے زمین میں بہکا دیا

[1] الأنعام 51:6 [2] الأنعام 70:6

ہو، وہ زمین میں حیران پھرتا ہو، اس کے کچھ ساتھی ہوں جو اسے سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہوں کہ ہمارے پاس آجا۔ کہہ دیجیے: بے شک ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے، اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سب جہانوں کے رب کے فرمانبردار ہو جائیں۔''[1]

اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۖ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ ۚ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٩٤﴾﴾

''اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آؤ گے جیسا کہ ہم نے پہلی بار تمھیں پیدا کیا تھا۔ اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے ہو۔ اور ہم تو تمھارے ہمراہ تمھارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ بے شک وہ تمھارے شریک ہیں۔ ان سے تمھارا تعلق ٹوٹ گیا ہے اور وہ تم سے کھو گئے ہیں جنھیں تم اپنے معبود خیال کرتے تھے۔''[2]

سورۂ انعام ایک عظیم سورت ہے اور اصول ایمان پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا:

﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۖ مَا لَكُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا شَفِيعٍ ۚ﴾

''پھر وہ عرش پر قائم ہوا۔ تمھارے لیے اس کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہیں۔''[3]

اور سورۂ زمر اس بارے میں ایک اصل عظیم کا حکم رکھتی ہے۔ اسی قبیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَىٰ حَرْفٍ ۖ فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ ۖ وَإِنْ أَصَابَتْهُ

---

① الأنعام 71:6

② الأنعام 94:6 ③ السجدة 4:32

فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ ﴿١١﴾ يَدْعُوا مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنفَعُهُ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ ﴿١٢﴾ يَدْعُوا لَمَن ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِن نَّفْعِهِ لَبِئْسَ الْمَوْلَىٰ وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ ﴿١٣﴾﴾

''اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہو گیا، اور اگر اسے کوئی آزمائش آپڑی تو اپنے منہ کے بل الٹا پھر جاتا ہے، اس نے دنیا اور آخرت میں خسارہ اٹھایا، یہی کھلا خسارہ ہے۔ وہ اللہ کے سوا اسے پکارتا ہے جو اسے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اسے نفع دے سکتا ہے۔ یہی ہے دور کی گمراہی۔ وہ اسے پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، بلاشبہ برا ہے وہ کارساز اور بلاشبہ برا ہے وہ ساتھی۔''[1]

اسی طرح فرمایا:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٤١﴾﴾

''جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کارساز مقرر کر رکھے ہیں ان کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ وہ بھی ایک گھر بنا لیتی ہے حالانکہ تمام گھروں سے زیادہ بودا اور کمزور گھر مکڑی ہی کا گھر ہے۔ کاش کہ وہ جان لیتے۔''[2]

الغرض قرآن مجید شروع سے آخر تک اسی اصل عظیم کو ثابت کر رہا ہے کیونکہ یہی دین کا اصل الاصول ہے۔ یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے یہ سارے کا سارا اس قسم کی دعا کی حرمت

---

[1] الحج 22:11-13 [2] العنکبوت 29:41

ثابت کرر ہا ہے، خواہ اس دعا سے کبھی فائدہ بھی حاصل ہو جائے اور یہی دعا مطلوبہ نتائج کا سبب بن جائے۔

صوفیوں اور فلسفیوں کی نظر میں دعا

پھر خود دعا کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ نام نہاد فلسفیوں اور مدعیانِ تصوّف میں سے ایک جماعت کا خیال ہے کہ دعا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ جس مطلب کے لیے دعا کی جاتی ہے، وہ مشیّتِ الٰہی اور اسبابِ علوی میں یا تو مقدر ہو چکا ہوگا یا مقدر نہیں ہوا ہوگا۔ اگر مقدر ہو چکا ہے تو دعا کی کوئی ضرورت نہیں، وہ لامحالہ واقع ہو جائے گا اور اگر مقدر نہیں ہوا ہے تو دعا بے کار اور غیر مفید ہے کیونکہ وہ مطلب ہرگز حاصل نہ ہوگا۔

ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ دعا مطلوب کے حصول پر بمنزلہ علامت و دلالت کے ہے۔ ان کے نزدیک دعا اور مطلوب میں وہی تعلق ہے جو دلیل اور مدلول میں ہوتا ہے، نہ کہ وہ تعلق جو سبب اور مسبب میں ہوتا ہے۔

مومنین کی نظر میں دعا

لیکن صحیح مسلک جمہور کا ہے اور وہ مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ دعا دوسرے تمام شرعی اور تقریری اسباب کی طرح مطلوب کے حصول کا سبب ہوتی ہے، خواہ دعا کو سبب کا نام دیا جائے یا جزوِ سبب کا، یا اسے شرط کہا جائے، مقصود ایک ہی ہے۔ اللہ جب بندے کے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ وہ دعا کرے اور مدد کا طالب ہو، پھر اس کی اسی دعا اور طلبِ نصرت کو اس کی بھلائی کا سبب بنا دیتا ہے جو اس کے حق میں مقدر ہو چکی ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''میرے ذمے صرف یہ ہے کہ دعا کروں، اس کی

مقبولیت میرے ذمے نہیں ہے لیکن جب میرے دل میں دعا ڈال دی جاتی ہے تو قبولیت بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔''

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے نکالنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں ڈال دیتا ہے کہ کھائے پیے۔ اسی طرح وہ جب بندے کو معاف کرنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں توبہ کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اسے اور معافی مل جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے پر رحمت نازل کرنا اور اسے جنت میں داخل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اہلِ جنت کے عمل آسان کر دیتا ہے۔

مشیّت الٰہی کا اقتضا یہی ہے کہ بھلائیاں اپنے قدرتی اسباب کے ساتھ وجود میں آئیں۔ جس طرح اس کا تقاضا ہے کہ جنت میں داخلہ عمل صالح کے ذریعے سے ہو، بچہ نر و مادہ کے اجتماع سے پیدا ہو اور علم، تعلیم سے حاصل ہو۔

بہر حال تمام امور کا مبدا اور ابتدا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور ان کا تمام ہونا بھی اسی پر موقوف ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بندہ پروردگار پر یا اس کے ملکوت پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ خود پروردگار اپنے ملکوت میں تنہا مؤثر ہے۔ وہی اپنے بندے کی دعا کو اس کے حق میں اپنی قضا وقدر کا سبب بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ کیا آپ کے خیال میں ہماری یہ دوائیں، جھاڑ پھونک اور احتیاطی تدابیر اللہ کی مشیّت کو ٹال سکتی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''یہ چیزیں بھی اللہ تعالیٰ کی مشیّت ہی ہیں۔''[1] یا جیسا کہ آپ نے فرمایا: ''دعا اور بلا آپس میں ملتی ہیں اور آسمان وزمین کے مابین لڑتی رہتی ہیں۔''[2]

---

[1] جامع الترمذي، الطب، باب ماجاء في الرقى والأدوية، حديث:2065 وسنن ابن ماجه، الطب، باب ماأنزل الله داء إلا أنزل له شفاء، حديث:3437 و مسند أحمد: 421/3۔ اس کی سند میں ابوخزامہ مجہول راوی ہے۔

[2] اسے ہیثمی نے مجمع الزوائد: 219/10 میں ذکر کر کے معجم طبرانی اور مسند بزار کی طرف منسوب کیا ہے۔ پھر ◄◄

یہ اس دعا کا حال ہے جو حصول مطلب کا سبب ہوتی ہے۔ رہ گئیں وہ دعائیں جو غیر مشروع اور ممنوع ہیں، سو ان پر ہم گزشتہ صفحات میں گفتگو کر آئے ہیں۔

◄◄ کہا ہے کہ اس کی سند میں زکریا بن منظور راوی ہے جسے جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے البتہ احمد بن صالح مصری اس کو ثقہ کہتا ہے اس کے علاوہ باقی تمام راوی ثقہ ہیں۔ نیز انھوں نے مسند بزار میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن اس کی سند میں ابراہیم بن خثیم بن عراک ضعیف اور متروک راوی ہے۔ غرضیکہ سند کے لحاظ سے یہ روایت کمزور ہے۔

13

منت یا نذر کی حقیقت

اسی قبیل سے نذر، یعنی منت ماننے کا معاملہ ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر سے منع کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''نذر سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا لیکن اس کے ذریعے سے بخیل سے روپیہ کھینچ لیا جاتا ہے۔''[1] اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نذر سے وہ بات کبھی حاصل نہیں ہوتی جو مقدر میں نہیں ہے لیکن نذر مقدر کے موافق ہوجاتی ہے اور اس کے ذریعے سے بخیل سے اللہ تعالیٰ وہ مال کھینچ لیتا ہے جو وہ ہنسی خوشی خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔''[2]

اس حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرمادیا ہے کہ نذر سے کچھ بھی فائدہ نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ حصول خیر ودفع شر کا ہرگز سبب نہیں ہے اور اگر وہ کبھی مفید معلوم ہوتی ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ بھلائی کا موجب ہوتی ہے بلکہ صرف اس لیے کہ اللہ نے جو بھلائی مقدر کر رکھی ہے، نذر اتفاق سے اس کے مطابق پڑجاتی ہے جیسا کہ دوسرے تمام اسباب اس کے مطابق ہو جایا کرتے ہیں۔ لہٰذا نذر یا منت ماننا بےکار ہے لیکن لوگ اس سے باز نہیں آتے کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے بخیلوں کا روپیہ کھینچ کر غریبوں کو دلاتا ہے ورنہ اگر یہ نذر کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ

---

① صحیح البخاری، الأیمان والنذور، باب الوفاء بالنذر......، حدیث: 6693 و صحیح مسلم النذر، باب النھی عن النذر......، حدیث: 1639

② صحیح البخاری، الأیمان والنذور، باب الوفاء بالنذر، حدیث: 6694 و صحیح مسلم، النذر، باب النھی عن النذر، حدیث: 1640

ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتے۔

یہ عجیب بات ہے کہ نذر سے کوئی فائدہ نہ ہونے پر بھی ان لوگوں کی تعداد، جو منتیں مانتے ہیں، قبروں کے پاس قبولیت کے اعتقاد سے دعائیں مانگنے والے لوگوں سے اگر زیادہ نہیں تو برابر ضرور ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ بعض لوگوں کی روٹی انھیں منتوں سے چل رہی ہے جو سرے سے حرام ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو قبروں کے مجاور اور پجاری ہیں، خوب عیش اڑاتے ہیں۔ منت ماننے والا بخیل سے بخیل آدمی بھی انھیں پوری فیاضی سے دیتا ہے اور اپنی حماقت سے سمجھتا ہے کہ اس کی مراد صرف منت ماننے کی وجہ سے پوری ہوئی ہے، حالانکہ صادق ومصدوق پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے صاف صاف فرمادیا ہے کہ ناجائز تو ناجائز رہیں خود جائز، مباح، حتیٰ کہ عبادت وطاعت الٰہی کی نذر بھی حصولِ مطلوب کا سبب نہیں ہے اور یہ کہ نذر ماننے کے بعد مطلوب حاصل ہوجاتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ اتفاق سے منت ایسے وقت میں مانی گئی جب کہ وہ مطلوب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے خود ہی حاصل ہونے والا تھا۔ یہی حال غیر مشروع دعاؤں کا بھی ہے، ان میں سے کوئی بھی غرض ومراد اور مقصد کے حصول کا سبب نہیں ہے۔

فصل 14

مغضوب علیہ، گمراہ اور ہدایت یافتہ

اس بارے میں لوگوں کے تین فرقے ہو گئے ہیں:

① مغضوب علیہ، یعنی وہ لوگ جو غضب الٰہی کے مستحق بن چکے ہیں۔

② ضالّون یعنی جو گمراہ ہو چکے ہیں۔

③ وہ لوگ جو ہدایت یافتہ ہیں۔

مغضوب علیہ تمام مشروع وغیر مشروع اسباب میں رد وقدح کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مشروع دعا کبھی اثر کرتی ہے کبھی اثر نہیں کرتی۔

ضالّون ہر اس بات کو سبب سمجھتے ہیں جس پر سبب ہونے کا ادنیٰ سا شبہ بھی ہو سکتا ہے، خواہ وہ یہود ونصاریٰ اور مجوس وغیرہ کے دین ہی کی بات کیوں نہ ہو۔

رہ گئے فلاسفہ تو وہ ہر تاثیر کو فلکی اثرات، نفسانی قویٰ اور طبیعی اسباب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور گھوم پھر کر اسی گورکھ دھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔

اہل حق کا مسلک

تیسرا گروہ ہدایت یافتہ افراد کا ہے۔ یہ لوگ کسی ایسی قوت یا طبیعت کا انکار نہیں کرتے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اجسام وارواح میں ودیعت کی ہے کیونکہ وہ بھی اللہ کی مخلوق ہیں لیکن ساتھ ہی وہ اس قوت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ان تمام قوتوں سے بالاتر ہے اور وہ قوت

اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ ہے جس کے ذریعے سے وہ ہر چیز پر قادر ہے، نیز ان کا یہ بھی ایمان ہے کہ وہ پروردگار ہمہ وقت کسی نہ کسی مشغولیت میں ہوتا ہے، اپنے بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اور اس قبولیت میں بندے کی اپنی نفسانی قوت یا اس کے جسمانی اور روحانی تصرف کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور یہ کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کی سچائی ظاہر کرنے اور ان کی عظمت قائم کرنے کے لیے خارق عادت امور ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اپنے اولیا کے لیے بھی خارق عادت امور ظاہر کرتا ہے، کبھی اس لیے کہ اس کے ساتھ اپنے دین کی تائید کرے اور کبھی اس لیے کہ اپنے اولیا کو دنیا ہی میں ثواب بخش دے۔ اور کبھی اس لیے کہ ان پر انعام کرے، خواہ وہ نعمت کے نزول کی صورت میں یا عذاب کو دور کرنے کی صورت میں ہو۔ نیز ان کا یہ ایمان ہے کہ اللہ صالح اعمال اور مشروع دعاؤں کے ذریعے سے ان قوتوں کو اگر چاہے تو دفع کر دیتا ہے جو اس نے اجسام وارواح میں رکھی ہیں۔ وہ اس طریقے پر قائم ہیں کہ ان وسائل وذرائع پر کبھی عمل نہیں کرتے جو شریعت نے حرام قرار دیے ہیں، خواہ ان کا اثر اور نفع لوگوں میں کتنا ہی مشہور ہو۔

غرضیکہ یقین رکھنا چاہیے کہ شرعی طور حرام کی ہوئی جو چیز بھی حصول مطلوب کا سبب سمجھی جاتی ہے وہ ہرگز سبب نہیں ہوسکتی۔ عقل کی کمزوری دوسری بات ہے، ورنہ ایسی کوئی بات بھی کسی صحیح دلیل سے ثابت نہیں ہوتی۔

پھر غور کرنا چاہیے کہ اس طرح کا نام نہاد سبب دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ سرے سے صحیح سبب ہی نہ ہوگا جیسے ایسی چیز کو دعا کے لیے پکارنا جو سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ کوئی نفع پہنچا سکتی ہے اور یا یہ کہ وہ سبب تو ہوگا لیکن اس کا نقصان اور مضرت اس کے نفع سے زیادہ ہوگی۔ اور ایسا سبب صحیح جس کی منفعت اس کی مضرت سے زیادہ ہو وہ شریعت میں حرام بھی نہ ہوگا کیونکہ شریعت میں وہی بات حرام ہے جو مضر اور نقصان دہ ہے۔

قبولیتِ دعا کا ایک سبب

سوال ہوسکتا ہے کہ یہ کیسے معلوم کیا جائے کہ فلاں واقعہ کسی خاص سبب سے پیش آیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ طبیعی امور کی طرح شرعی امور میں بھی اس کے معلوم کرنے کے متعدد طریقے ہیں اور ان میں سے ایک ہے، مجبوری کا پیش آ جانا۔[1]

چنانچہ عہد نبوی میں لوگ بارہا بھوکے پیاسے ہوئے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے تھوڑے سے پانی میں دست مبارک رکھ دیا اور آپ کی انگلیوں سے پانی کے فوارے پھوٹنے لگے۔[2] اسی طرح تھوڑے سے کھانے میں ہاتھ رکھ دیا اور بے حد فراوانی ہوگئی۔[3] اسی طرح کے واقعات میں لامحالہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ کھانے اور پانی میں زیادتی محض رسول اللہ ﷺ کے سبب سے ہوئی۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص پر تلوار کی شدید ضرب پڑے اور وہ

---

[1] یعنی آدمی کو کسی بات کی ضرورت کا حد درجہ سچا ہونے کا احساس بھی اس کے وقوع پذیر ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ مثلاً سخت بیمار ہوجاتا ہے اور سچے دل سے تندرستی کی آرزو کرتا رہتا ہے تو اکثر تندرستی حاصل ہو جاتی ہے۔ قوت ارادہ، زبردست قوت ہے یہی قوت ارادہ حکم الٰہی سے دنیا میں بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے دکھاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر سچے ارادے کیساتھ پہاڑ کو کہو کہ چلا آئے تو وہ بھی چلا آئے گا'' آدمی اپنی قوت سے سب کچھ کرسکتا ہے۔ ہر آدمی میں اللہ نے یہ قوت رکھی ہے اور باقی تمام قوتوں کی طرح مشق وریاضت سے یہ قوت ترقی کر جاتی ہے۔ مسمریزم اور ہپناٹزم وغیرہ کے حیرت ناک اثرات اسی قوت ارادہ کے معمولی کرشمے ہیں، تھوڑی محنت وتوجہ سے ہر آدمی اپنی اس قوت کو ترقی دے سکتا ہے۔

[2] صحيح البخاري، المغازي، باب غزوة الحديبية، حديث:4152و صحيح مسلم، الزهد، باب حديث جابر الطويل......، حديث:3013

[3] صحيح البخاري، الشركة، باب الشركة في الطعام ...... الخ، حديث:2484 وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعاً، حديث:27

مر جائے تو یہی یقین کیا جائے گا کہ موت اسی ضرب سے واقع ہوئی ہے، چنانچہ کھانے پینے میں اس طرح اچانک اضافے کا کوئی بھی معلوم سبب موجود نہیں تھا لیکن جب اس میں اضافہ ہوگیا تو بغیر کسی شک وشبہ کے مان لینا پڑا کہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کے سبب سے ایسا ہوا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دعا دی تھی کہ اللہ ان کی اولاد اور مال میں افزونی بخشے۔[1] چنانچہ ان کا نخلستان سال میں دو مرتبہ پھل لایا کرتا تھا۔[2] حالانکہ نخلستان ایک مرتبہ سے زیادہ پھل نہیں دیتے اور اولاد میں اتنی کثرت ہوئی کہ خود اپنے بیٹے اور پوتے سو سے زیادہ تعداد میں دیکھ لیے۔ ایسے واقع کا سبب اس دعا کے سوا اور کچھ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اگر شیر خوار بچے کو دیکھو کہ وہ بلک رہا ہے پھر ماں اسے دودھ پلانا شروع کر دے اور وہ چپ ہو جائے تو اس کے سوا اور کیا یقین کریں گے کہ دودھ کی وجہ سے وہ خاموش ہوگیا ہے۔

بعض بزرگوں کی دعائیں

یہی معاملہ دعاؤں کا ہے۔ مومن کبھی دعا کرتا ہے اور مقصد فوراً حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ اس کے اسباب بالکل موجود نہیں ہوتے، یا وہ اللہ کے نام پر کوئی کام کرتا ہے اور وہ فوراً پورا ہو جاتا ہے مثلاً حضرت علاء بن الحضرمی رضی اللہ عنہ نے دعا کی کہ اے علیم! اے حلیم وبردبار! اے ارفع واعلیٰ! اے عظیم و برتر! ہمیں سیراب کر دے۔ دعا کے ساتھ ہی پانی برسنا شروع ہوگیا حالانکہ سخت گرمی کا دن تھا اور ابر کا کہیں نشان تک نہ تھا، اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ بارش صرف اسی مقام پر ہوئی جہاں وہ اپنا لشکر لیے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے، اسی طرح انھوں

---

[1] صحيح البخاري، الدعوات، باب دعوة النبي ﷺ لخادمه بطول العمر وبكثرة ماله، حديث: 6344 و صحيح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أنس بن مالك رضي الله عنه، حديث: 2481

[2] اسی حدیث مذکور کے تحت دیکھیے: فتح الباري: 11/173-174

نے دعا کی کہ یا اللہ! ہمیں سوار کر دے، سامنے بہت بڑا دریا تھا مگر وہ اس سے اس طرح گزر گئے کہ ان کے گھوڑوں کی کونچیں تک نہ بھیگیں۔

غرضیکہ اللہ وحدہ لاشریک سے دعا کرنے کے فوائد ومنافع کو آسمانی وحی کے علاوہ عقل صحیح بھی ثابت کر رہی ہے۔ پھر اتنے بے شمار تجربے ان کی تائید کر رہے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی ان کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ بے حد وحساب موقعوں پر دیکھا گیا ہے کہ مومنین نے اللہ سے دعا کی اور ایسی چیزیں طلب کیں جن کے اسباب موجود نہ تھے اور اللہ نے وہ چیزیں ان کی دعا کے بموجب موجود کر دیں۔ ظاہر ہے ایسے واقعات کبھی یقین دلا دیتے ہیں اور کبھی گمان غالب کر دیتے ہیں کہ دعا ہی ان کا حقیقی سبب تھی۔ تمام عقل وبصیرت والے حضرات جو دلائل کی حقیقت، شروط، اور ان کے تواتر وغیرہ جیسے امور سے واقف ہیں، اسے تسلیم کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے حرام دعاؤں کی منفعت کا اعتقاد صرف جہلا میں پایا جاتا ہے جو دلیل اور غیر دلیل میں کوئی تمیز نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کو دلیل کی شرائط کا علم ہے۔ اور کفر ونفاق اور معاصی کی تاریکیوں میں وہی لوگ گرتے ہیں جن کے دل سیاہ ہو جانے کی وجہ سے حق وباطل کی تمیز سے محروم ہو چکے ہیں۔

فصل 15

قبر نبوی کے پاس دعا

رہ گیا اس دعا کا معاملہ جو مناسک حج میں ذکر کی جاتی ہے کہ نبی معظم ﷺ اور صاحبین رضی اللہ عنہما پر درود وسلام کے بعد دعا کی جائے تو اس کے متعلق امام احمد وغیرہ جیسے ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس کا طریقہ یوں بتایا ہے کہ جب درود وسلام سے فارغ ہو جائیں اور اپنے لیے دعا کرنا چاہیں تو قبلہ کی طرف رخ کریں اور حجرۂ نبوی کی بائیں جانب رہیں تاکہ ادھر پشت نہ ہو جائے۔ مگر اس دعا کی وجہ سے ہمارے مذکورہ بالا ایمان پر اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ قبر کے پاس نفس دعا ممنوع ومکروہ نہیں بلکہ میت کے لیے دعا مانگنے کا تو حکم ہے، جیسا کہ سنت سے ثابت ہے اور جس کا ضمناً بیان بھی ہو چکا ہے۔ مکروہ صرف یہ بات ہے کہ دعا کرنے کی غرض سے خاص طور پر قبر کا قصد کیا جائے۔[1]

اصحاب مالک رحمہم اللہ کا اس بارے میں یہ فیصلہ ہے کہ زیارت کرنے والا قبر نبوی کے قریب جائے اور سلام کرے پھر قبر شریف کی طرف پیٹھ کرے اور قبلہ رو ہو کر دعا کرے، بعض علماء نے پیٹھ کرنے سے منع کیا ہے مگر یہ ایک دوسری بحث ہے اور یہاں ضروری نہیں۔

ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم نے یہ طریقہ شاید اس لیے تجویز کیا ہے کہ قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ جیسا کہ سنتِ رسول اللہ سے اس کی ممانعت اوپر ثابت ہو چکی ہے۔ چونکہ

---

[1] یعنی اپنے حق میں دعا کرنے کے لیے وہاں جانا۔ ورنہ میت کے لیے دعائے مغفرت کی غرض سے قبر پر جانا مستحب ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ نے ممانعت کردی ہے کہ قبر کو مسجد یا قبلہ قرار دیا جائے، اسی لیے علماء نے بھی ممانعت کی ہے کہ جس طرح قبر کی طرف نماز نہیں پڑھنی چاہیے اسی طرح خاص طور پر اس کے سامنے کھڑے ہوکر دعا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے تو مبسوط میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میری رائے میں مناسب نہیں کہ نبی کریم ﷺ کی قبر کے پاس بھی کھڑے ہوکر دعا کی جائے بلکہ سلام کرکے فوراً چلے جانا چاہیے۔

اور غالباً اسی لیے حجرۂ نبوی کو تعمیر کے وقت ترچھا اور مثلث کردیا گیا ہے، چنانچہ اس کی شمالی دیوار قبلہ کی سمت نہیں رکھی گئی اور یہ بالکل ٹھیک ہوا ہے۔ کیونکہ دعا کرنے والے کے لیے اسی طرف رخ کرنا مستحب ہے جس طرف نماز پڑھنا مستحب ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ سمت کعبہ کو چھوڑ کر مشرق یا کسی اور سمت منہ کرکے نماز پڑھنے سے منع کردیا گیا ہے، اس لیے یہ بھی روا نہیں رکھا گیا کہ آدمی اپنی دعاؤں کے لیے خاص طور پر ان ممنوع سمتوں ہی کی طرف رخ کرے۔

بدعتیوں کی دعا

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ دعا کے لیے اسی سمت کو اختیار کرتے ہیں جس طرف کسی بزرگ کی قبر واقع ہو حالانکہ یہ کھلی گمراہی ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ اس سمت پیٹھ نہیں کرتے جس طرف کسی بزرگ کی قبر ہو، کعبہ اور قبر نبوی والی سمتوں کی طرف بے پروائی سے پیٹھ کردیتے ہیں۔ دراصل یہ تمام طریقے بدعت کے طریقے ہیں اور نصاریٰ کے دین سے ملتے جلتے ہیں۔

اس بارے میں علمائے امت کا اس درجہ اہتمام رہا ہے کہ انھوں نے درود وسلام میں بھی بڑی سختی سے سنت نبوی کو قائم رکھا ہے۔ تاکہ ڈھیل دینے سے کہیں یہ معاملہ مکروہ اور پھر نصاریٰ ی

کے طریقے تک نہ پہنچ جائے اور یہ اس لیے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمادیا تھا کہ ''میری قبر کو عید نہ بنانا''[1] اور فرمایا: ''مجھے اس طرح نہ سراہنا جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو سراہا ہے۔ میں تو اللہ کا محض ایک بندہ ہوں، لہٰذا صرف یہ کہا کرو کہ (محمد ﷺ) اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''[2]

قبر نبوی پر حاضری

اس بارے میں یہاں تک احتیاط مدنظر تھی کہ بعض اکابر کو قبر نبوی پر سلام کرنے میں بھی شبہ پیدا ہوگیا، یہاں تک کہ انھیں بتایا گیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سلام کیا کرتے تھے، اسی لیے امام مالک رحمہ اللہ اور دوسرے علمائے مدینہ نے وہاں کے باشندوں کے لیے یہ بات مکروہ قرار دی ہے کہ جب بھی مسجد میں آئیں تو خاص طور سے قبر پر بھی جا کر نبیٔ کریم ﷺ اور صاحبین رضی اللہ عنہما کو سلام کریں۔ وہاں اس کی اجازت صرف اس صورت میں دی ہے کہ اگر لوگ کہیں سفر پر جا رہے ہوں یا سفر سے واپس آئے ہوں تو سلام کر سکتے ہیں۔

بعض علماء نے یہ ناپسند کیا کہ آدمی جب بھی مسجد نبوی میں نماز، تلاوت قرآن پاک یا دعا وغیرہ کے لیے داخل ہو تو وہ آپ کو سلام بھی کرے۔ البتہ خاص طور پر درود وسلام کے لیے ہمیشہ قبر پر جانے کی میرے علم کے مطابق کسی نے اجازت نہیں دی کیونکہ یہ بھی قبر کو ایک طرح عید بنالینا ہے۔ ہمارے لیے مشروع چیز صرف اس قدر ہے کہ جب مسجد نبوی میں داخل ہوں تو

---

[1] سنن أبی داود، المناسك، باب زیارة القبور، حدیث:2042و مسند أحمد:327/2۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] صحیح البخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللّٰه تعالیٰ: ﴿واذکر فی الکتاب مریم......﴾ الخ، حدیث:3445

کہیں: [اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ][1] ٹھیک وہی سلام جو ہم اپنی ہر نماز میں کرتے ہیں۔ بلکہ مستحب تو یہ بھی ہے کہ جب آدمی کسی خالی مکان میں داخل ہو تو نبی کریم ﷺ پر سلام بھیجے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ آپ کو سلام ہر جگہ سے پہنچ جاتا ہے۔[2] جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اس چیز میں اتنی احتیاط اسی لیے کی ہے کہ ہر وقت قبر پر ایسا کرنا اسے عید بنا لینے کی طرح ہے۔ پھر یہ بدعت بھی ہے کیونکہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے زمانوں میں مہاجرین وانصار رضی اللہ عنہم مسجد ہی میں پانچوں نمازیں پڑھتے تھے مگر قبر پر سلام کرنے نہیں جایا کرتے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے ناپسند کیا ہے اور اس سے منع فرمایا ہے۔ وہ صرف یہ کرتے تھے کہ مسجد میں آتے جاتے وقت آپ پر سلام بھیجتے تھے، ٹھیک وہی سلام جو ہر نماز میں پڑھتے ہیں اور جو وہ آپ کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے طریقے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے اپنے والد کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب سفر سے واپس آتے تو نبی اکرم ﷺ کی قبر پر حاضر ہوتے اور درود وسلام کے بعد کہتے: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَابَكْرٍ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَبَتَاه ''ابوبکر (رضی اللہ عنہ) آپ پر سلام، میرے باپ (عمر رضی اللہ عنہ) آپ پر سلام۔''[3]

---

[1] ''اے نبی! آپ پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت وبرکتوں کا نزول ہو۔''

[2] ابن أبي شيبة: 2/83/1 و مسند أبي يعلى: و فضل الصلاة على النبي لإسماعيل القاضي: و المختارة لضياء المقدسي: 154/1 و الموضح للخطيب: 30/2۔ اس کی سند میں علی بن عمر مستور راوی ہے، لہٰذا یہ ضعیف ہے۔ البتہ اس حدیث کا مفہوم صحیح ثابت ہے، دیکھیے: سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حدیث: 2042 و مسند أحمد: 367/2۔

[3] اسے سعید بن منصور نے اپنی ''سنن'' میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن زید ضعیف ہے۔

شرک و بدعت کی علت

امام مالک رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اس امت کا آخری زمانہ بھی اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول زمانہ درست ہوا ہے۔'' لیکن ہوتا یہ ہے کہ امتیں اپنے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے عمل میں جتنی زیادہ کمزور ہوتی جاتی ہیں اوران کے ایمان میں جتنا زیادہ نقص پیدا ہوتا جاتا ہے ان کا اتنا ہی شرک و بدعت کی طرف رجحان بھی بڑھتا ہے۔ اسی لیے امت اسلامیہ نے قبر نبوی کو بوسہ دینے، تبرک کے خیال سے اس کا مسح کرنے تک کو ناپسند کیا اوراس کی تعمیر اس طور پر کردی کہ لوگوں کی اس تک رسائی نہ ہو۔ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ جس میں آپ مدفون ہیں، مسجد نبوی سے متصل تھا۔ خلفائے راشدین اور بعد میں بھی یہی حالت رہی، یہاں تک کہ ولید بن عبدالملک نے اس کی ازسرنو تعمیر کی۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ مدینہ کے گورنر تھے، انھوں نے اطراف کے تمام حجرے خرید کر مسجد میں شامل کردیے۔ اسے بھی بہت سے علماء مثلاً سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے قابل اعتراض سمجھا اور بعض نے اعتراض نہ کیا۔

قبر نبوی کا مسح

ابوبکر بن الاثرم کی روایت ہے کہ میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے پوچھا کہ قبر نبوی کا مسح کرنا اور پھر منہ پر ہاتھ پھیرنا کیسا ہے؟ انھوں نے فرمایا: میں اس کے جواز سے واقف نہیں ہوں۔ ابوبکر کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر کا مسح؟ امام احمد رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ ہاں روا اور جائز ہے کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بابت ایک روایت میں آیا ہے کہ انھوں نے منبر کا مسح کیا تھا۔ اور سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رُمّانہ (جو منبر پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے اور ہاتھ رکھنے کی جگہ تھی) کا مسح کیا۔ میں نے کہا اور یحییٰ بن سعید رحمہ اللہ

کی بابت بھی یہی مروی ہے کہ جب وہ عراق جانے لگے تو منبر کے پاس آئے اور اس کا مسح کیا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے جواب دیا، شاید یہ کرنا ضرورت کے وقت ٹھیک ہے۔ اس پر ایک شخص نے کہا: لوگ قبر شریف کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا: لیکن میں نے مدینہ کے اہل علم کو دیکھا ہے کہ وہ قبر کا مسح نہیں کرتے بلکہ ایک طرف کھڑے ہو کر سلام کرتے ہیں، امام احمد رحمہ اللہ نے جواب دیا: ہاں یہی درست ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ نے منبر اور رُمّانہ (جو منبر پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے اور ہاتھ رکھنے کی جگہ تھی) کا مسح کرنے کی اجازت تو دی ہے مگر آپ کی قبر کا مسح کرنے کی اجازت نہیں دی۔

لیکن امام مالک رحمہ اللہ نے منبر کا مسح بھی مکروہ قرار دیا ہے جس طرح قبر کا مسح مکروہ ہے، لیکن اب سرے سے یہ بحث ہی اٹھ گئی ہے کیونکہ منبر جل چکا ہے اور اس کے ساتھ رمانہ بھی باقی نہیں رہا، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے جس قدر منقول ہے وہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشست گاہ کا مسح کیا تھا۔

دعا کے لیے قبروں کا انتخاب

دعا کے لیے خصوصیت کے ساتھ قبروں کا قصد کرنا اس وجہ سے بھی مکروہ ہے کہ سلف صالحین رحمہم اللہ نے اسے ناپسند کیا ہے اور حدیث نبوی ''میری قبر کو عید (مزار) نہ بنانا''[1] کا یہی مطلب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ہم حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ اور ان کے ابن العم حضرت

---

[1] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 و مسند أحمد:2/367۔ اس کی سند صحیح ہے۔

حسن بن حسن ؒ کے اقوال سے وضاحت کر چکے ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں سب سے افضل اہل بیت تھے اور حجرہ نبوی کے پاس رہنے والے اور اپنی رشتہ داری کی وجہ سے اس بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے۔

نیز ہم امام احمد ؒ وغیرہ کے فتاوی نقل کر آئے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور صاحبین رضی اللہ عنہما پر سلام کے بعد اگر کوئی شخص اپنے لیے دعا کرنا چاہے تو حجرے سے منہ پھیر کر قبلہ رخ ہو جائے اور دعا کرے۔ اسی طرح بہت سے متقدمین مثلاً امام مالک ؒ وغیرہ اور بہت سے متاخرین مثلاً ابوالوفا بن عقیل اور ابوالفرج بن جوزی وغیرہ رحمہم اللہ نے اسے مکروہ بتایا ہے۔

غرض میرے علم میں نہیں کہ کسی صحابی، تابعی یا کسی مشہور امام نے خاص طور پر قبروں کے پاس دعا کو مستحب بتایا ہو اور اس بارے میں نبی کریم ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین یا ائمہ رحمہم اللہ سے ایک حرف بھی روایت نہیں کیا گیا۔ بہت سے علماء نے دعا اور اس کے مقامات کی بابت کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں تمام متعلقہ آثار جمع کر دیے گئے ہیں، لیکن کسی کتاب میں ایک حرف بھی قبروں کے پاس دعا کی فضیلت کے بارے میں موجود نہیں۔ پس جب سلف صالحین رحمہم اللہ اس کام سے بالکل ناواقف تھے، بلکہ اس سے منع کرتے تھے پھر وہ کیونکر مستحب و افضل قرار پاسکتا ہے۔

قبروں پر دعا کب شروع ہوئی؟

بلاشبہ ہم اس طرح کی باتیں تیسری صدی ہجری کے بعض لوگوں کے کلام میں کہیں کہیں پاتے ہیں کہ فلاں شخص کی قبر کے پاس دعا قبول ہونے کی امید ہے یا فلاں شخص کی قبر کے پاس دعا کرنی چاہیے لیکن ان اقوال کے ساتھ ساتھ ان پر ہمیں اعتراض بھی ملتا ہے، اس طرح کی بات کہنے والے کی بابت بہتر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس مسئلے میں مجتہد یا مقلد تھا، اور امید

ہے کہ اللہ اسے معاف کردے گا۔ رہ گیا اس کا قول تو وہ کسی حال میں بھی صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے ان اقوال کے زمرے میں رکھا جائے گا جو بعض لوگ کہا کرتے ہیں مثلاً فلاں دریا، کنواں، درخت، غار، پتھر، یا بت مقدس ہے اور اس کے پاس دعا قبول ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے، جس طرح یہ اقوال شریعت میں اصول نہیں بن سکتے، اسی طرح قبروں کی بابت مذکورہ بالا قول بھی شریعت میں کوئی اصل قرار نہیں پاسکتا۔

واہی روایتیں

اس کے متعلق سلف صالحین سے بھی اس کے جواز میں کوئی روایت نہیں ملی، سوائے ایک روایت کے جسے ابن ابی الدنیا نے ''کتاب القبور'' میں محمد بن اسمٰعیل بن ابی فدیک سے نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کی کہ ''جو کوئی میری قبر کی زیارت کرے گا، میں قیامت کے دن اس کا شفیع وگواہ ہوں گا۔''[1]

نیز یہ کہ ابن ابی فدیک نے کہا: میں نے بعض علماء کو کہتے سنا ہے کہ جو کوئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر کھڑا ہوکر یہ آیت پڑھے:

﴿إِنَّ ٱللَّهَ وَمَلَٰٓئِكَتَهُۥ يُصَلُّونَ عَلَى ٱلنَّبِيِّ﴾

''یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔''[2]

اور پھر ستر مرتبہ صَلَّى اللّٰهُ يَامُحَمَّدُ کہے تو اسے ایک فرشتہ پکار کر کہتا ہے کہ اے

---

① اسے ابن ابی الدنیا نے ''کتاب القبور'' میں روایت کیا ہے اور سیوطی نے ''الجامع الصغير: 140/6'' میں اسے ''شعب الإيمان'' بیہقی کی طرف منسوب کرکے اس کے حسن ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن حقیقت میں یہ ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابوالمثنی سلیمان بن یزید الکعبی متروک اور منکر الحدیث راوی ہے۔

② الأحزاب 56:33

شخص! تجھ پر اللہ کا درود اور رحمت ہو۔ اس کے بعد اس شخص کی جو مراد بھی ہو، پوری ہو جائے گی۔[1]

ممکن ہے کہا جائے اس روایت سے قبر پر دعا کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ابن ابی فدیک نے یہ روایت ایک مجہول الحال راوی سے لی ہے اس طرح کی روایتوں سے کوئی شرعی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔ پھر خود ابن ابی فدیک تابعی ہے نہ مشہور تبع تابعی کہ اس کے قول کا کچھ وزن تسلیم کیا جائے اور شبہ پیدا ہو سکے کہ اس نے ایک ایسی بات روایت کی ہے جو خیر القرون میں رائج تھی، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ مستند علمائے مدینہ نے اس طرح کی کوئی بات نقل نہیں کی۔ اور پھر صحیح حدیث اس روایت کے خلاف آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ''جو کوئی مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے۔''[2] لیکن اس روایت میں کہا گیا ہے کہ ستر مرتبہ درود بھیجنے والے پر فرشتہ ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اور وہ ایسی حالت میں جب کہ یہ ستر مرتبہ درود قبر نبوی کے سامنے پڑھا جائے، حالانکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نزدیک و دور ہر جگہ سے یکساں طور پر آپ کو درود پہنچ جاتا ہے۔[3]

رہ گئیں وہ روایتیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے نبی کریم ﷺ یا صالحین کی قبر پر جا کر سلام کیا اور قبر کے اندر سے اس کا جواب سنا، یا یہ کہ سعید بن مسیب رحمہ اللہ جنگ حرہ کی راتوں میں قبر نبوی کے اندر سے اذان کی آواز سنتے تھے، یا یہ کہ اس قحط سالی میں جو

---

[1] اسے ابن ابی فدیک نے مجہول الحال سے روایت کیا ہے اور اس کے آگے سند میں بھی انقطاع ہے لہٰذا یہ سخت ضعیف ہے۔ اور ویسے بھی یہ روایت صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

[2] صحيح مسلم، الصلاة، باب الصلاة على النبي ﷺ بعد التشهد، حديث:408

[3] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 و مسندأحمد:367/2۔ اس کی سند صحیح ہے۔

عام الرمادہ کے نام سے مشہور ہے، ایک شخص قبر نبوی پر آیا اور قحط کی مصیبت بیان کی تو خود رسول اللہ ﷺ کو قبر سے باہر نکلتے دیکھا اور آپ نے حکم دیا کہ ''عمر (رضی اللہ عنہ) سے کہو کہ نماز استسقا پڑھیں'' یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات ممکن ہے اپنی جگہ پر صحیح ہوں لیکن ہماری بحث میں شامل نہیں، ان سے غیر مشروع دعا کے جواز پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ نبی اکرم ﷺ یا کسی اور صالح آدمی کے حق میں تو بے شک یہ واقعات کرامت قرار دیے جا سکتے ہیں، مگر ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جس شخص کی دعا پر اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا، وہ بھی اپنی دعا میں حق بجانب اور متبع شریعت تھا۔

تعظیم قبور سے کیوں منع کیا جاتا ہے؟

یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنے اور انھیں مسجد بنانے سے اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اصحاب قبور کی بزرگی سے انکار ہے۔ بلکہ منع صرف اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ لوگ فتنے میں نہ پڑ جائیں۔ انبیاء علیہم السلام اور صالحین رحمہم اللہ کی قبروں پر رحمت و کرامت الٰہی کا جس قدر نزول ہوتا ہے اس کے عشر عشیر سے بھی اکثر لوگ واقف نہیں لیکن اس کے باوجود کسی حال میں بھی ان کی قبروں کے پاس نماز، دعا اور عبادت کے التزام و خصوصیت کو جائز نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس سے بکثرت مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ پہلے سے جان چکے تھے۔

عرس

پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ قبروں کے پاس دعا مستجاب ہونے کے عقیدے نے یہ دستور جاری کر دیا ہے کہ لوگ ان پر پابندی کے ساتھ آمد و رفت رکھتے ہیں۔ بہت سی قبریں ایسی ہیں کہ

مقرر دنوں میں ان پر عرس ہوتا ہے، حالانکہ بالکل ایسی ہی چیز سے نبی اکرم ﷺ نے یہ فرما کر منع کیا تھا کہ ''میری قبر کو عید نہ بنانا''[1] اور فرمایا تھا: ''یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو، جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبریں مسجدیں بنالی ہیں۔''[2] اور فرمایا تھا: ''تم قبروں کو مسجدیں نہ بنانا، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں نے کیا تھا۔''[3] بہت سی قبریں ایسی ہیں کہ ان پر سال کے مقرر مہینوں اور تاریخوں میں عرس ہوتا ہے۔ وہاں لوگ خاص دنوں میں ٹھیک اسی طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح عرفات، مزدلفہ اور منیٰ میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ ان عرسوں کا اہتمام اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ دین و دنیا کی کسی بھی چیز کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔ لوگ دور دور سے چل کر آتے ہیں جس طرح بیت اللہ کے لیے جاتے ہیں بلکہ بہت سے لوگ اس سفر کو بھی حج ہی کے نام سے موسوم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''فلاں کی قبر کا حج کرنے جا رہے ہیں۔''

قبروں کے پاس دعا و عبادت کے لیے سفر کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ اس بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ کسی مسلمان نے اختلاف کیا ہو، الّا یہ کہ متاخرین میں سے کسی مجہول الحال نے اسے جائز بتایا ہو، جس کے متعلق میں نہیں جانتا۔ یہ بالکل واضح ہے کیونکہ قبر کو عید بنا لینے کے یہی معنی ہیں۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، المناسك، باب زيارة القبور، حديث:2042 و مسند أحمد 2/367۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] صحيح البخاري، الصلاة، باب55 حديث: 436,435 و صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور ......، حديث:530

[3] صحيح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، حديث:532

[4] یہ چیز شریعت میں بالکل حرام ہے اور اس کے کرنے والے حدیث کی رو سے ملعون ہیں لیکن اس کے باوجود اس وقت بے شمار مسلمان اسی کو اصلی دین اور سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ اجمیر وغیرہ مقامات کے عرسوں میں جوق در جوق جاتے ہیں۔ بہت سے لوگ عبادت کرنے اور منتیں ماننے اور بہت سے لوگ فسق و فجور اور نفس پرستی کرنے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان عرسوں میں طوائفیں بھی جمع ہوتی ہیں۔ عجیب معاملہ ◄◄

اسی طرح مصر میں حضرت نفیسہ وغیرہ کی قبریں، عراق میں وہ قبر جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سمجھی جاتی ہے نیز حضرت حسین، حذیفہ بن یمان، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم اور موسیٰ بن جعفر، محمد بن جواد، احمد بن حنبل، معروف کرخی، بایزید بسطامی رحمہم اللہ جیسے صالحین کی قبروں پر جو اجتماع ہوتے ہیں سب اسی حکم میں داخل ہیں۔ بدعتیوں نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ بہت سی قبروں پر مسجدیں بھی بنادی ہیں، جن میں سے بعض غصب شدہ زمین پر تعمیر کی گئی ہیں۔[1]

صالحین سے محبت کا طریقہ

یہ صالحین رحمہم اللہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے محبت کی جائے، ان کی پیروی کی

◄◄ یہ ہے کہ بہت سے گدی نشین اولیاء اللہ ان طوائفوں کی نذریں بھی قبول کرتے ہیں اور انھیں برکت دیتے ہیں۔ دراصل یہ عرس کے میلے اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ بزرگوں کی ہڈیاں بیچنے والے قبروں کے مجاور حرام طریقے سے مسلمانوں کا مال کھاسکیں۔ چونکہ فساق وفجار سے بھی کافی روپیہ کھینچا جاسکتا ہے اس لیے انھیں عرسوں میں ترغیب دینے کے لیے فاحشہ عورتیں جمع کی جاتی ہیں۔ درحقیقت یہ عرس شریعت میں حرام اور موجب لعنت ہونے کے علاوہ، تمام دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے والے ہیں۔ اسی قدر نہیں بلکہ مسلمانوں کی کمائی کا ایک بڑا حصہ ان پر برباد ہوجاتا ہے اور وہ قومی کام، جو دنیا وآخرت میں ان کی نجات کا باعث ہوسکتے ہیں، کافی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رکے پڑے ہیں۔ برصغیر کے مفلس مسلمان ان عرسوں پر سالانہ کروڑوں روپیہ صرف کرتے ہیں اگر صرف ایک سال ہی کے لیے یہ اس ملعون کام سے باز رہیں اور یہ رقم قومی کاموں میں لگادی جائے تو کتنا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ مگر کہے کون۔ گمراہ صوفی اور نام نہاد مولوی تو باہم سازش کیے ہوئے ہیں۔ صوفیا مسلمانوں کو اس گمراہی کی طرف علی الاعلان بلا رہے ہیں اور مولوی اس پر سکوت اختیار کیے ہوئے ہیں تاکہ صوفی ان کی حرام کمائی میں مداخلت نہ کریں۔ اس طرح یہ دونوں گروہ حرام مال کھا کر موٹے ہورہے ہیں اور بے چارے مسلمان تباہ ہورہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ!

[1] مصر میں اکثر مساجد قبروں پر بنائی گئی ہیں۔

جائے، جس طرح انھوں نے دین کا احیا کیا ہے اسی طرح ہم بھی کریں اور ان کے لیے مغفرت ورحمت اور رضوانِ الٰہی کی دعائیں کریں لیکن ان کی قبروں کو عید ہرگز نہیں بنانا چاہیے کیونکہ یہ فعل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دے دیا ہے، لہٰذا ہمیں اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

عید بنا لینے کا مطلب بیان ہو چکا کہ مقرر اوقات میں وہاں جانا اور جمع ہونا۔ تمام مسلمان اس کی حرمت پر متفق ہیں، کسی نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اس قسم کی حرکتیں کرنا درحقیقت یہود ونصاریٰ سے مشابہت ہے، جو کسی طرح بھی روا نہیں۔

اس بدعت کی بنیاد دراصل اسی اعتقاد پر ہے کہ قبروں کے پاس دعا کرنا افضل ہے اور ایسا کرنے سے دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اگر یہ اعتقاد دلوں سے نکل جائے تو یہ بدعت بھی مٹ جائے گی۔ ہم ایک مرتبہ پھر تاکید کے ساتھ کہتے ہیں کہ قبروں کے پاس دعا کرنے سے بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اس لیے وہاں دعا کرنا اسی طرح حرام ہے جس طرح وہاں نماز پڑھنا، بلکہ دعا کی حرمت اس سے بھی زیادہ ٹھہرتی ہے کیونکہ یہ دعا مخلوق کے لیے سخت فتنہ ہے، شرک کا دروازہ کھولنے والی اور ایمان کا دروازہ بند کرنے والی چیز ہے، لہٰذا جس مسلمان کو اپنا ایمان عزیز ہے اور اسے اپنی آخرت سنوارنے کا خیال ہے، اسے اس بدعت سے ضرور بچنا چاہیے۔[1]

---

[1] اللہ کی رحمت ہو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ پر، بہت ہی سچ فرما گئے ہیں۔ فی الحقیقت اسی بدعت نے مسلمانوں سے ایمان سلب کر لیا ہے۔ وہ منہ سے اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں مگر دل غیر اللہ کی تعظیم وعبادت پر ریجھے ہوئے ہیں۔ غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ آج کے مسلمان شرک میں ہندوؤں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ ہندوؤں کے زیادہ تر بت ان کے زعم میں صفاتِ الٰہی کے مجسمے ہیں اور اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان صفات کا تصور ممکن اور عبادت الٰہی آسانی سے انجام پا سکے۔ لیکن مسلمانوں کے دیوتا بے حد وحساب ہیں اور جا بجا قبروں میں بند ہیں۔ ہر وہ قبر جس پر چادر ڈال دی جائے، فوراً دیوتا بن جاتی ہے۔ ہر قسم کی منتیں ◄◄

◄ اور مرادیں اس سے وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ عرب کے بت پرست جن سے رسول اللہ ﷺ نے جہاد کیا تھا، وہ بھی اس درجہ مشرک نہ تھے، جس درجہ اس وقت کے مسلمان ہیں۔ اس پر بھی دعویٰ یہ ہے کہ ہم امت محمدی ہیں اور جنت ہماری ہے۔ اگر چہ دنیا میں ذلیل ترین مخلوق بن گئے ہیں۔ بے حیائی کا یہ عالم ہے کہ نہایت بے ہودہ اعمال کرنے پر بھی ہر مشرک مسلمان اپنے آپ کو حد درجہ نیک سیرت اور غیر مسلم سے افضل سمجھتا ہے اور ڈنکے کی چوٹ اس کا اعلان کرتا پھرتا ہے۔

قبروں پر عبادتیں

گزشتہ صفحات میں معلوم ہو چکا کہ نبی کریم ﷺ نے قبروں کو مسجدیں بنانے، ان کے پاس نماز پڑھنے اور انھیں عید بنانے سے منع کیا ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ آپ کی قبر کو بت بنا کر نہ پوجا جائے اور یہ بھی مذکور ہو چکا کہ کسی جگہ کو عید بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بار بار عبادت اور ثواب کے خیال سے جایا جائے، نیز یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ قبروں پر سلام کرنے اور ان میں مدفون میت کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز وہ فرق بھی بتایا جا چکا ہے جو خاص طور پر قبر کے پاس خود اپنے لیے دعا کرنے اور اتفاقیہ یا ضمناً وہاں دعا کر لینے میں ہے لیکن یہ بحث نامکمل رہے گی اگر چند کلمات بقیہ عبادات کی نسبت بھی نہ کہہ دیے جائیں۔

قبروں کے پاس خصوصیت سے عبادت کرنے کا وہی حکم ہے جو دعا مانگنے کا حکم ہے۔ لہٰذا وہاں ذکر الٰہی، تلاوتِ قرآن، روزہ، قربانی، وغیرہ عبادات سر انجام دینے میں ہرگز کوئی فضیلت نہیں اور خصوصیت کے ساتھ ان عبادتوں کا وہاں کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح دعا کرنا ناجائز ہے۔ آج تک مجھے نہیں معلوم کہ کسی ایک عالم دین نے یہ کہا ہو کہ قبروں کے پاس عبادت دوسری جگہ کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔

قبر پر قرآن خوانی

رہ گیا بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ قبر پر قرآن پڑھنے سے میت کو ثواب ملتا ہے، تو اگر اس سے

یہ مطلب ہے کہ صرف قبر ہی پر پڑھنے سے ثواب ملتا ہے اور دوسری جگہ پڑھنے سے نہیں ہوتا تو یہ کسی بھی اہلِ علم نے نہیں کہا۔

اس مسئلہ میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جس طرح بالاجماع مالی عبادات کا ثواب میت کو ملتا ہے اسی طرح بدنی عبادات کا ثواب بھی اسے پہنچ جاتا ہے۔ یہ ابوحنیفہ، احمد اور بعض اصحابِ شافعی و مالک ﷺ کی رائے ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ بدنی عبادات کا ثواب سرے سے پہنچتا ہی نہیں، اکثر علمائے شافعی و مالکی اسی کے قائل ہیں۔

لیکن اس اختلاف کے باوجود کسی نے جگہ کی یہ تخصیص نہیں کی کہ فلاں جگہ سے ثواب پہنچتا ہے اور فلاں جگہ سے نہیں۔ میت کا کچھ آوازوں کو سن لینا ثابت ہوسکتا ہے لیکن مرجانے کے بعد میت کو کسی دوسرے آدمی کے عمل پر ثواب حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ اسے اپنے ہی کیے ہوئے اچھے یا برے اعمال کے بدلے کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ بلاشبہ اسے لوگوں کے اس نیک عمل سے فائدہ پہنچتا ہے جس کا وہ راستہ بتا کر گیا ہو اور اس دعا سے بھی جو اس کے حق میں کی جائے۔ [1]

---

[1] اوپر کے پیراگراف کی روشنی میں سمجھ لینا چاہیے کہ جن مالی و بدنی عبادات کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے، وہ وہی ہیں جن کا سبب وہ خود بن کر دنیا سے گیا ہے۔ نصوص قرآنیہ واحادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ میت کو زندہ آدمیوں کے عمل کا ثواب نہیں پہنچ سکتا، بجز ان تین صورتوں کے جن کا ذکر احادیث میں آچکا ہے۔ یعنی صدقہ جاریہ کر جائے، علم نافع چھوڑ جائے اور اولاد صالح چھوڑ جائے جو اس کے حق میں دعا کرے۔ (صحیح مسلم، الوصیة، باب مایلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته، حدیث: 1631) مگر ظاہر ہے کہ یہ تینوں صورتیں خود میت کے اپنے عمل ہیں۔ اگر قرآن خوانی اور ورثا کا صدقہ وخیرات وغیرہ میت کو فائدہ پہنچا سکتے تو سلف صالحین اس سے بے خبر نہ ہوتے بلکہ اس پر عمل کرتے اور مرنے والوں کو اس طریقے سے ثواب پہنچاتے رہتے۔ لیکن یہ ہرگز ثابت نہیں کہ خیرالقرون میں کبھی کسی نے اس طرح کی کوئی بات کہی ہو یا عمل کیا ہو۔ پھر عقلاً بھی یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کے عمل سے میت کو فائدہ حاصل ہوسکے۔ مرنے کے بعد آدمی کے سامنے خود اس کے اپنے عمل ہوتے ہیں۔ اگر روح گندی اور پلید ہوکر گئی ہے تو ساری دنیا کتنی ہی خیرات کرے اور کتنے ہی قرآن پڑھے، اسے پاک نہیں کرسکتی۔ اگر اسی طرح ثواب ◄◄

اس بارے میں اختلاف ہے کہ زندہ آدمیوں کے نوحے سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے یا نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا: میت کو ان گناہوں سے تکلیف ہوتی ہے جو اس کے پاس کیے جاتے ہیں۔'' تو پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح اسے تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی سن کر خوشی بھی حاصل ہوتی ہوگی۔ اگر یہ استدلال مان لیا جائے تو بھی قبر پر تلاوت کا استحباب ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ اگر یہ مشروع ہوتا تو نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے لیے بیان کر دیا ہوتا۔

یہ چیز اگر مفید ثابت ہو جائے تو بھی جائز نہ ہوگی کیونکہ اس میں فساد کا پہلو غالب ہے جس طرح کہ قبر کے پاس نماز پڑھنے کا بیان گزر چکا ہے۔ اور پھر قرآن خوانی کی بنسبت مردے کو زندہ کی دعا و استغفار اور صدقے سے کہیں زیادہ نفع حاصل ہوتا ہے، تو کیوں نہ وہی کام کیا جائے جو مشروع بھی ہے اور جملہ مفاسد سے دور بھی ہے۔ اسی لیے علمائے اسلام میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ قبر پر تلاوت ہونی چاہیے کیونکہ یقین سے معلوم ہو چکا ہے کہ اسے نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کے لیے مشروع نہیں کیا۔

ہاں جو کچھ اختلاف ہے وہ قبر کے پاس مطلق قراءت کے بارے میں ہے اور اس بارے میں امام احمد رحمہ اللہ کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اصحاب ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی جماعت کا بھی یہی خیال ہے اور یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی اس وصیت کی بنا پر ہے جو انھوں نے انتقال کے وقت کی تھی کہ دفن کے بعد ان کی قبر پر سورۂ بقرہ کی ابتدائی و آخری آیتیں پڑھی جائیں۔[1]

◄◄ پہنچانے پر بخشش حاصل ہو سکتی تو کوئی بادشاہ اور مال دار کبھی عذاب الٰہی کا منہ نہ دیکھتا۔ فقہا کے قیل وقال پر نہیں بلکہ کتاب و سنت اور عمل صالح پر اپنے دین کی بنیاد استوار کریں۔

[1] بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی قبروں پر بعض دوسرے کاموں کی وصیت کی تھی مگر ان کی وصیتیں ◄◄

دوسرا قول یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے حتیٰ کہ اس قول کے ماننے والوں میں سے بہت زیادہ فقہا نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت بھی مکروہ قرار دی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے یہ قول ان کے اکثر اصحاب نے روایت کیا ہے۔ یہی ان کے مقرب تلامذہ عبدالوہاب وراق اور ابوبکر مروزی وغیرہما رحمہما اللہ کا بھی مذہب ہے، نیز جمہور سلف جیسے امام ابوحنیفہ وامام مالک وہشیم بن بشیر وغیرہم رحمہم اللہ کا فتویٰ بھی یہی ہے۔ خود امام شافعی رحمہ اللہ سے اس بارے میں کچھ منقول نہیں کیونکہ وہ اسے سرے سے بدعت سمجھتے تھے۔ پھر امام مالک رحمہ اللہ کی یہ تصریح خاص اہمیت رکھتی ہے کہ میرے علم میں یہ فعل کسی نے نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ صحابہ وتابعین ایسا نہیں کرتے تھے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ صرف دفن کے وقت قبر کے پاس قراءت میں مضائقہ نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔

قرآن خوانی کے لیے اوقاف

رہ گیا ان اوقاف کا معاملہ جو لوگ اپنی قبروں پر تلاوت قرآن کریم جاری رکھنے کے لیے کر جاتے ہیں، تو ان کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ وہ حفظ قرآن میں معاون ہیں، حفاظ کرام کے لیے رزق بہم پہنچاتے اور لوگوں کو حفظ ودرس قرآن کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ قاری کو اپنی قراءت پر کوئی ثواب نہیں ملتا تو بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دین کی حفاظت کے یہ اوقاف بھی ایک ذریعہ ہیں، جس طرح کہ کافر کی قراءت اور فاجر کا جہاد بھی

◀◀ امت کے لیے شریعت نہیں بنیں۔ اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ وصیت بھی شریعت نہیں بن سکتی۔ شرح العقيدة الطحاوية لابن أبي العز، ص:458و کتاب "الروح" لابن القيم: ص: 33۔ اس کی سند ضعیف ہے تفصیل کے لیے دیکھیے علامہ البانی رحمہ اللہ کی کتاب أحكام الجنائز: ص: 192,193۔ اس کی سند میں عبدالرحمن بن العلاء بن اللجلاج مجہول راوی ہے۔

حفاظت دین کا ایک ذریعہ ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اس دین کی تائید فاجر آدمی سے بھی کراتا ہے۔''[1] یہ مقام ان اوقاف کی بحث و تحقیق کا نہیں ہے۔ قبروں کے پاس اللہ کا ذکر مکروہ تو نہیں ہے لیکن خاص طور پر ذکر کے لیے قبر پر جانا مکروہ اور بدعت ہے۔ اس سے قبروں کو عید بنالینا لازم آتا ہے اور یہی حکم قبروں کے پاس روزہ رکھنے کا بھی ہے۔

پھر یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے قبروں کے پاس تلاوت کی اجازت دی ہے انھوں نے بھی انھیں عید بنانا روا نہیں رکھا ہے، یعنی ایک مقررہ وقت میں قراءت کے لیے وہاں جانا، جمع ہونا، ان کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

قبروں پر خیرات

اسی طرح قبر پر قربانی قطعاً ممنوع ہے۔ کیونکہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: ''اسلام میں جانوروں کا قبر پر ذبح کرنا جائز نہیں۔''[2] یہ جاہلیت کا دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی قبر پر جانور ذبح کیے جاتے تھے نبیٔ کریم ﷺ نے اس سے بالکل منع کر دیا ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے ایسے ذبیحے کا کھانا بھی مکروہ قرار دیا ہے، نیز ہمارے ہم مشرب علماء نے کہا ہے کہ یہی حکم اس روٹی اور غلے وغیرہ کا بھی ہے، جو ہمارے زمانے میں قبروں پر خیرات کیے جاتے ہیں۔[3]

---

① صحيح البخاری، الجهاد، باب إنّ الله ليؤيد الدين بالرجل الفاجر، حديث: 3062 و صحيح مسلم، الإيمان، باب بيان غلظ تحريم قتل الإنسان ...... ، حديث: 111

② سنن أبي داود، الجنائز، باب كراهية الذبح عند القبر، حديث: 3222 و مسند أحمد: 3/197۔ اس کی سند صحیح ہے۔

③ یہی حکم ہر اس کھانے کا ہے جو غیر اللہ کے نام پر بطور کار ثواب کے تیار کیا جائے۔

قبر کا مجاور بننا

یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ قبروں کا مجاور بننا اور بیت اللہ کی طرح ان پر پردے لگانا بھی حرام ہے۔[1] ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قبر پر مسجد بنانا بالاتفاق اسلام میں ناجائز ہے۔[2] اور اگر اس فعل کے ساتھ اس بدعت کا بھی اضافہ کر دیا جائے تو حرمت اور بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ قبر پرستوں میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مسجد حرام میں مجاورت واعتکاف سے کہیں زیادہ ان مسجدوں میں مجاورت واعتکاف پسند کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نزدیک قبروں پر بنائی گئی مساجد کی حرمت وعزت ان عام مساجد کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے جو اللہ کے گھر ہوتے ہیں اور تقویٰ ورضوانِ الٰہی کی بنیاد پر قائم کیے گئے ہوتے ہیں۔ شیطان نے ان بدعتوں اور خرافات کے ذریعے سے بہت سے لوگوں کو شرکِ عظیم میں مبتلا کر دیا ہے، حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کا یہ اعتقاد ہو گیا ہے کہ ان مساجد ومشاہد اور مزعومہ درباروں کی زیارت، جو انبیاء ومشائخ یا اہل بیت کی قبروں پر تعمیر کیے گئے ہیں، حج بیت اللہ سے بھی زیادہ افضل اور موجب ثواب وبرکت ہے۔ اسی قدر نہیں بلکہ بعض اس زیارت کو حج اکبر کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ایسے شرکیہ عقائد سے

---

[1] لیکن یہی حرام کام اس وقت عبادت بنا ہوا ہے، قبروں پر بیش قیمت چادریں ڈالی جاتی ہیں اور پردے لٹکے ہوئے ہیں اور ایسی آرائش اور سج دھج ہے کہ شاید ہی کسی مسجد کو حاصل ہو۔

[2] صحیح مسلم، المساجد، باب النهي عن بناء المسجد على القبور، حديث:532

محفوظ و مامون رکھے۔)

بعض کا اعتقاد ہے کہ قبر نبوی کی زیارت کے لیے سفر، حج بیت اللہ سے افضل ہے۔ چنانچہ یہ لوگ صرف مدینے جا کر لوٹ آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ایسی عبادت کر آئے ہیں جو حج سے بڑھ کر ہے۔[1] بلاشبہ نبی اکرم ﷺ کعبہ سے افضل ہیں لیکن ان جاہلوں کو کیسے سمجھایا جائے کہ خود کعبہ کی دیواروں اور پتھروں کی عبادت نہیں کی جاتی بلکہ کعبہ کے گرد گھوم کر اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کی جاتی ہے۔ قبروں پر اس مقصد سے جانا جائز نہیں ہے کہ ان کی پوجا کی جائے، یا ان سے مرادیں اور منتیں مانی جائیں بلکہ صرف اس لیے وہاں جایا جاتا ہے کہ مُردوں کے حق میں دعا کی جائے۔ اگر ان جہلاء کو اس مقصد کا علم ہو جائے تو وہ اس قبیح شرک سے بچ سکتے ہیں۔

میت اور غائب سے دعا

بہت سے جہلا کی عادت ہے کہ وہ میت سے اور غیر حاضر شخص سے اس طرح مخاطب ہو کر التجا کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔ پھر ان میں سے بعض کو اس بزرگ کی شکل بھی نظر آ جاتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ بزرگ نے میری دعا سن لی ہے حالانکہ وہ بزرگ نہیں بلکہ شیطان ہوتا ہے جو گمراہ کرنے کے لیے بزرگ کے روپ میں ظاہر ہو جایا کرتا ہے۔

اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ فوت شدہ انبیاء و صالحین ان تمام ناجائز باتوں سے سخت نفرت کرتے ہیں، جو اب ان کی قبروں پر کی جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی بھی مسلمان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قبروں کو عید اور بت بنانے سے اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اصحاب قبور کی

---

[1] جہلا کا خیال ہے کہ جو حاجی مدینہ نہیں گیا اس کا حج ہی نہیں ہوا۔ شریف حسین کی بغاوت کے زمانے میں مدینہ کا راستہ بند تھا اس لیے میں وہاں نہ جا سکا۔ واپسی پر لوگوں نے سنا تو افسوس کرنے لگے کہ اتنی تکلیف بھی اٹھائی اور حج بھی نہ ہو سکا اور یہ اس لیے کہ مدینہ میں حاضری ممکن نہ ہو سکی تھی۔

توہین وتحقیر ہو بلکہ اس سے مقصود تو ان بزرگوں کی تعظیم وتکریم ہی ہوتی ہے۔[1]

جب دلوں پر بدعت کا قبضہ ہو جائے

حقیقت یہ ہے کہ جب دلوں پر بدعت کا قبضہ ہو جاتا ہے تو ہدایت وسنت کی ان میں گنجائش نہیں رہتی۔ مشاہدہ اس حقیقت کو پوری طرح ثابت کر رہا ہے۔ بدعتی لوگ خود انھی بزرگوں کی سنت پس پشت ڈالے ہوئے ہیں جن کی قبروں کی پرستش اتنے ذوق وشوق سے کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی نبی یا ولی کی تعظیم کا صحیح طریقہ یہ نہیں کہ اس کی قبر پر جھاڑو لگایا جائے اور اس پر سجدے کیے جائیں، بلکہ صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ اس کی بتائی ہوئی ہدایت پر عمل کیا جائے تاکہ اسے ان پیروی کرنے والوں کے نیک اعمال پر ثواب حاصل ہو۔ جیسا کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا: ”جو کوئی کسی ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو اسے ان لوگوں کے ثواب کے برابر ثواب ملتا ہے جو اس کی پیروی کرتے ہیں، اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔“[2]

لیکن ان لوگوں کے دلوں پر بدعتی عبادتیں حاوی ہوگئی ہیں۔ کوئی خود ساختہ دعاؤں میں

---

[1] نجدیوں نے حجاز میں قبروں پر موجود عمارتیں عین شریعت الٰہی کے مطابق ڈھادی ہیں۔ اس پر قبر پرست مسلمان ناخوش ہیں اور کہتے ہیں کہ نجدیوں نے ان بزرگوں کی سخت توہین کی ہے۔ حالانکہ انھوں نے توہین نہیں کی بلکہ ان کی عزت قائم کردی ہے۔ ان کی پاک روحوں کو اس تکلیف سے چھٹکارا دلا دیا ہے جو صدیوں سے انھیں اپنی قبروں پر عمارتوں کی موجودگی اور بدعتوں کی وجہ سے لاحق تھی۔ اب ان کی قبریں ویسی ہی ہوگئی ہیں جیسی وہ خود اپنی زندگی میں پسند کرتے تھے اور جیسی ان کے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ یہ بزرگانِ دین کتاب وسنت کے حامل تھے۔ کتاب وسنت نے قبروں پر عمارتیں کھڑی کرنے سے منع کیا ہے۔ وہ اپنے زمانے میں کسی قبر پر عمارت نہیں بناتے تھے، لیکن ان سے بہت مدت بعد جب بدعتیوں کو اقتدار حاصل ہوا تو انھوں نے انتہائی ظلم کے ساتھ ان بزرگوں کی قبروں پر ان کی پسند کے بالکل برعکس عمارتیں کھڑی کردیں۔ خوش ہونا چاہیے کہ نجدیوں نے یہ ظلم اب دور کردیا ہے۔

[2] صحیح مسلم، العلم، باب من سنّ سنّة حسنة أو سيئة ...... الخ، حديث:2674

منہمک ہے، کوئی عرسوں کا دلدادہ ہے اور کوئی قوالی پر مرا جا رہا ہے اور یہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ مشروع عبادتوں سے دل بیزار ہو گئے ہیں، اگر چہ بظاہر ان پر عمل جاری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی دلی توجہ سے پانچوں نمازیں پڑھتا ہے اور ان کلمات طیبات اور عمل صالح کا شعور رکھتا ہے جو نمازوں میں موجود ہے تو اسے کسی بدعت کی طرف رغبت ہو ہی نہیں سکتی، خواہ لوگ اس بدعت کے کتنے ہی فوائد بیان کریں۔

اسی طرح جو کوئی عقل وشعور اور توجہ کے ساتھ کلام اللہ اور کلام رسول ﷺ سنتا ہے تو اسے اس میں ایسی لذت وحلاوت اور برکت ومنفعت حاصل ہوتی ہے جو کسی آدمی کی نظم ونثر میں نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جو کوئی مشروع دعائیں ان کے اوقات میں کرتا ہے، مثلاً سحری کے وقت، نمازوں کے بعد اور سجود وغیرہ میں، تو اسے مبتدع دعاؤں کی طرف کبھی توجہ ہو سکتی ہے نہ ان کی ضرورت ہی محسوس ہو سکتی ہے۔

لہٰذا عقل مند شخص کو چاہیے کہ ہر بات میں اتباع سنت کی پوری کوشش کرے۔ تمام بدعتیں بالکل ترک کر دے اور سنتیں اختیار کر لے کیونکہ جو کوئی بھلائی تلاش کرتا ہے، پا لیتا ہے اور جو کوئی شر سے بچنا چاہتا ہے، بچ جاتا ہے۔

مقامات انبیاء وصالحین

انبیاء وصالحین کے مقامات، یعنی وہ جگہیں جہاں وہ رہے یا ٹھہرے یا عبادت کی، لیکن انھیں مسجد قرار نہیں دیا تو ان کی بابت میرے علم میں مشہور علماء کے دو قول ہیں۔ ایک قول ممانعت اور کراہت کا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ کسی ایسی جگہ عبادت کے لیے قصد کرنا، جسے شریعت نے خصوصیت نہیں دی، ناجائز ہے۔ اگر شریعت نے کسی جگہ کو اس قسم کی خصوصیت بخشی ہے تو اس کا قصد کرنا چاہیے۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ نے خاص طور پر اس جگہ عبادت کی ہو، جیسے مقام ابراہیم،[1] عام مساجد، یا آپ اپنی مسجد میں ''اُسطُوَانة''[2] کے پاس خصوصیت سے نماز پڑھا کرتے تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اگر کبھی کبھی ایسے مقامات کا قصد کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ ان مقامات کا قصد کیا کرتے تھے،[3] جن سے نبی کریم ﷺ گزرے تھے اگرچہ آپ کا گزرنا محض اتفاقیہ ہی کیوں نہ ہو۔ امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ احمد بن قاسم نے بیان کیا کہ ہم نے امام احمد رحمہ اللہ سے مدینہ منورہ میں

---

[1] صحیح البخاري، الصلاة، باب ماجاء في القبلة ......، حدیث:402 و صحیح مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل عمر رضی اللہ عنہ حدیث:2399

[2] صحیح البخاري، الصلاة، باب الصلاة إلى الأسطوانة، حدیث: 502 و صحیح مسلم، الصلاة، باب دُنوّ المصلي من السترة، حدیث: 509

[3] صحیح البخاري، الصلاة، باب المساجد التي على طرق المدینة، حدیث:483

ایسے مقامات پر جانے کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گزرگاہوں کی پیروی کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ایک مرتبہ دیکھا گیا کہ ایک جگہ کھڑے بلاضرورت پانی گرا رہے ہیں۔ سبب پوچھا گیا تو کہا: میں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں پانی گراتے دیکھا ہے، یا جیسا کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ انھوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ میرے گھر میں آکر نماز پڑھ دیجیے تاکہ میں اسے عبادت گاہ بنالوں۔[1] ان دونوں روایتوں کے موجب ان مقامات کے قصد میں مضائقہ نہیں، لیکن لوگوں نے اس میں بہت افراط کردی ہے۔

اس قول میں امام احمد رحمہ اللہ نے واضح کردیا ہے کہ جن مقامات میں انبیاء وصالحین کے آثار ہیں مگر مسجدیں نہیں ہیں، ان میں کبھی کبھار اعتدال کے ساتھ جانے میں اور افراط کرنے میں کیا فرق ہے، یعنی وہ افراط جو دوسرے لفظوں میں انھیں عید بنالینے کے مفہوم میں داخل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سرزنش

یہ افراط یقیناً مکروہ ہے۔ جیسا کہ معرور بن سوید رحمہ اللہ کی روایت میں ہے کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کرنے گئے۔ آپ نے راستہ میں دیکھا کہ لوگ ایک طرف دوڑ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا چکر ہے؟ کہا گیا کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی اس

[1] مصنف نے یہ واقعہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ ہمیں مکمل چھان بین کے بعد بھی صحیح بخاری وصحیح مسلم سے معلوم نہ ہوسکا اور نہ ہی کسی اور کتاب سے کوئی اشارہ ملا ہے، البتہ یہی واقعہ ایک دوسرے نابینا صحابی عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے اور شاید نابینا ہونے کے وصف سے مصنف کو شبہ پڑ گیا ہو اور انھوں نے یہ واقعہ نابینا صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کردیا۔ بہرحال دیکھیے: صحیح البخاری، الصلاۃ، باب المساجد فی البیوت: حدیث:465 و صحیح مسلم، الإیمان، باب الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعاً، حدیث:33

لیے یہ لوگ بھی وہاں نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر آپ خفا ہوگئے اور فرمایا کہ تم سے پہلے اہلِ کتاب اسی طرح ہلاک ہوچکے ہیں کہ انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے آثار کو عبادت گاہ بنا لیا تھا، تم ایسا مت کرو۔ اگر ایسی جگہ نماز کا وقت ہوجائے تو پڑھ لو ورنہ آگے بڑھ جاؤ، خصوصیت کے ساتھ وہاں نماز نہ پڑھو۔[1]

شجرۃ الرضوان

اسی طرح محمد بن وضاح وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہ درخت کٹوا ڈالا تھا، جس کے نیچے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی تھی۔[2] کیونکہ لوگ اس کے نیچے عقیدت کے ساتھ جانے لگے تھے۔[3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوا کہ فتنہ نہ پیدا ہوجائے، چنانچہ انھوں نے اسے کٹوا ڈالا۔

بہت سے علماء نے ان مشاہد میں جانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ امام مالک اور دوسرے علمائے کرام، مدینہ منورہ میں مسجد قبا اور احد پہاڑ کے سوا وہاں کی باقی تمام مساجد اور آثار میں جانے کو ناپسند کرتے تھے۔ اسی طرح سفیان ثوری رحمہ اللہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی لیکن دوسری زیارت گاہوں میں نہیں گئے، ان علماء نے اس چیز کو علی الاطلاق مکروہ قرار دیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے اس کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔

---

① مصنف ابن أبی شیبۃ: 1/84/2۔ اس کی سند شیخین کی شرط پر ہے۔ دیکھیے: تحذیر الساجد للألبانی: ص:137 و فتح الباری: 569/1

② یعنی وہ درخت جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔

③ ابن أبی شیبۃ: 2/73/2۔ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، لیکن نافع اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے، لیکن یہ روایت بخاری کی اس روایت کے معارض ہے جس میں نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ جب ہم بیعت کے بعد اگلے سال آئے تو ہم میں سے کسی دو شخصوں کا بھی اتفاق نہ ہو سکا کہ کون سے درخت کے نیچے بیعت ہوئی تھی۔ مزید دیکھیے: تحذیر الساجد للألبانی: ص:137-138

نیز اس میں قبروں کے پاس نماز پڑھنے کی مماثلت موجود ہے، جو انھیں عید بنا لینے کا ذریعہ ہے اور اہل کتاب سے بھی مشابہت پائی جاتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل

رہ گیا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل تو ان کی موافقت کسی صحابی نے نہیں کی۔ چنانچہ خلفائے راشدین اور دوسرے مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی منقول نہیں کہ وہ خصوصیت کے ساتھ ان جگہوں کا قصد کرتے ہوں، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اترتے تھے۔ اس لیے جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک ہی صحیح ہے۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت اور آپ کے ہر فعل کی اتباع ٹھیک اسی طرح کی جائے جو آپ کے پیش نظر تھی، چنانچہ اگر آپ نے عبادت کے لیے خاص طور پر کسی جگہ کا قصد کیا ہے تو بلا شبہ اس کا قصد کرنا چاہیے، لیکن جہاں کہیں آپ نے محض اتفاقیہ نماز پڑھ لی اور اسے کوئی خصوصیت نہیں بخشی تو ہمارا اس جگہ کا قصد کرنا اور اسے خصوصیت دینا آپ کی پیروی قرار نہیں پاسکتا۔

ایک اہم فرق

رہ گئی حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس کی بنا پر امام احمد رحمہ اللہ نے اسے اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ اسے عید نہ بنا لیا جائے، یعنی بار بار وہاں آمدورفت نہ رکھی جائے اور مقررہ اوقات میں جماؤ نہ کیا جائے، تو اس حدیث سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ مسجد بنانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے چاہا کہ ایسی جگہ بنائیں جہاں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ دیں تاکہ خود آپ ہی اس مسجد کا نقش قائم کرنے والے اور آغاز کرنے

والے ہوں، یہ چیز اس چیز سے بالکل مختلف ہے کہ نبی ﷺ نے کہیں اتفاقیہ نماز پڑھ لی ہے۔ بے شک اگر اس جگہ مسجد بنانے کی ضرورت ہو تو بنائی جا سکتی ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ جگہ متبرک ہے اور وہاں نماز پڑھنا کسی دوسری جگہ نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ ہاں ان مقامات میں خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنی اور دعا کرنی چاہیے جہاں آپ ﷺ نے خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھی اور دعا کی ہے۔

لہٰذا دونوں باتوں میں فرق کرنا چاہیے۔ اوّل الذکر صورت میں بدعت ہونے کا احتمال ہے اور دوسری صورت میں اتباع سنت ہوتی ہے۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل

نبیٔ کریم ﷺ نے جن مقامات پر اتفاقیہ نماز پڑھی تھی، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سوا کسی صحابی سے مروی نہیں کہ اس نے ان مقامات کو کسی طرح کی بھی خصوصیت دی ہو۔ چنانچہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم اور تمام سابقین اولین من المہاجرین والانصار رضی اللہ عنہم ان راستوں پر حج اور عمرے وغیرہ کے لیے سفر کرتے تھے مگر کبھی ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے تھے، لہٰذا اگر یہ بات ان کے نزدیک مستحب ہوتی تو وہ سب سے پہلے عمل کرنے والے ہوتے کیونکہ وہ سنت نبویہ کے سب سے زیادہ جاننے والے اور اس پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے تھے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''تم میری سنت اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت اختیار کرنا، اسے خوب مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ خبردار! نئی نئی باتیں نہ گھڑنا کیونکہ ہر نئی گھڑی ہوئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''[1]

---

[1] سنن أبي داود، السنة، باب في لزوم السنة، حديث:4607 و جامع الترمذي، العلم، باب ماجاء في الأخذ بالسنة واجتناب البدعة، حديث:2676۔ اس کی سند صحیح ہے۔

اور معلوم ہے کہ خلفائے راشدین نے یہ بات کبھی نہیں کی۔ لہٰذا اس فعل میں خلفا کی سنت کی نہیں بلکہ ایک بدعت کی پیروی ہوتی ہے۔ اور صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے استدلال نہیں کیا جاسکتا کیونکہ صحابی کا قول اس وقت حجت نہیں رہتا جب کوئی دوسرا صحابی اس سے اختلاف کرے اور یہاں تو صرف ایک صحابی ہیں جو تمام صحابہ سے الگ بات کہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں ان کا فعل ہرگز حجت تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

شرک کی بیخ کنی

پھر ان مقامات پر خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنا، انھیں مساجد بنا لینے اور اہل کتاب سے مشابہت پیدا کر لینے کا ذریعہ ہوسکتا ہے جبکہ ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کا سبب بن سکتا ہے اور شارع نے شرک کی قطعی طور پر بیخ کنی کر دی ہے۔ حتیٰ کہ طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنے [1] اور قبروں کو مسجد قرار دینے سے [2] بھی منع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے اگر ایسے اوقات ومقامات میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا ہے تو پھر خصوصیت کے ساتھ ایسے مقامات پر دعا ونماز کیونکر مستحب ہوسکتی ہے جہاں انبیاء وصالحین نے محض اتفاقیہ دعا وعبادت کی تھی؟ اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ غار حرا اور جبل ثور میں بھی خصوصیت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے۔ نیز یہی حکم باقی تمام ایسے مقامات کا بھی ہو جائے گا جہاں بیان کیا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آثار موجود ہیں۔ مثلاً دمشق کے جبل قاسیون پر وہ دو مقامات جو

---

[1] سنن النسائی، المواقیت، باب الساعات التی نهی عن الصلاة فیها، حدیث: 561 و جامع الترمذی، الجنائز، باب ماجاء في کراهیة الصلاة علی الجنازة عند طلوع الشمس وعند غروبها، حدیث:1030۔ اس کی سند صحیح ہے۔ مزید دیکھیے: صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب الأوقات التی نهی عن الصلاة فیها، حدیث: 831

[2] صحیح مسلم، المساجد، باب النهی عن بناء المسجد علی القبور......، حدیث:532

حضرت ابراہیم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہیں۔ نیز وہ غار بھی جسے خون قابیل کا غار کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسے مقامات حجاز وشام وغیرہ میں بکثرت موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ وہی جو قبروں کے مفاسد کا نتیجہ ہو چکا ہے۔ کہا جائے گا کہ یہاں عبادت کرو کیونکہ یہ فلاں نبی کا مقام ہے، یہاں نماز پڑھو کیونکہ یہ فلاں ولی کی جگہ ہے، یہاں دعا کرو کیونکہ یہ فلاں شہید کی اقامت گاہ ہے اور یہ سب دعوے مجہول روایتوں یا بے بنیاد خوابوں کی بنا پر کیے جاتے ہیں اور پھر بتدریج یہ مقامات، مسجدیں اور عبادت گاہیں قرار پا کر بت بن جائیں گی جنھیں پوجا جائے گا۔ اس طرح شرک عام ہوتا چلا جائے گا جس کی بنیاد جھوٹ پر ہے۔

شرک کی بنیاد جھوٹ پر ہے

اور شرک کی پوری عمارت درحقیقت جھوٹ پر کھڑی کی گئی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں شرک اور جھوٹ کا ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ جس طرح سچ اور اخلاص کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے دو مرتبہ فرمایا: ''جھوٹی گواہی، شرک باللہ کے برابر گناہ ہے۔'' پھر یہ آیت تلاوت کی:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ ﴿٣٠﴾ حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ﴾

''پس تم بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو، اللہ کے لیے یکسو ہو جاؤ نہ کہ اس کے ساتھ شرک کرنے والے۔''[1]

---

[1] سنن أبی داود، القضاء، باب فی شهادة الزور، حدیث:3599 و سنن ابن ماجه، الأحكام، باب شهادة الزور، حدیث :2372۔ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ خریم بن فاتک کا نبی اکرم ﷺ سے سماع ثابت نہیں، لہٰذا اس بنا پر مرسل روایت ہے۔ دیکھیے: ضعیف ابن ماجه للألبانی، حدیث:518۔ ص:183۔(الحج 22:30-31)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَآءِيَ ٱلَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٧٤﴾ وَنَزَعْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا فَقُلْنَا هَاتُوا۟ بُرْهَـٰنَكُمْ فَعَلِمُوٓا۟ أَنَّ ٱلْحَقَّ لِلَّهِ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا۟ يَفْتَرُونَ ﴿٧٥﴾ ﴾

''اور جس دن اللہ پکار کر انھیں فرمائے گا کہ تم جن کو میرے شریک خیال کرتے تھے وہ کہاں ہیں؟ اور ہم ہر امت میں سے ایک گواہ الگ کر لیں گے اور ہم فرمادیں گے کہ اپنی دلیلیں پیش کرو۔ پس اس وقت وہ جان لیں گے کہ حق اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ افترا وہ جوڑتے تھے سب ان کے پاس سے گم ہو جائے گا۔''[1]

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں فرمایا:

﴿ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِۦ مَاذَا تَعْبُدُونَ ﴿٨٥﴾ أَئِفْكًا ءَالِهَةً دُونَ ٱللَّهِ تُرِيدُونَ ﴿٨٦﴾ ﴾

''اس (ابراہیم) نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ تم کیا پوجتے ہو؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر جھوٹے معبود چاہتے ہو؟''[2]

اور فرمایا:

﴿ تَنزِيلُ ٱلْكِتَـٰبِ مِنَ ٱللَّهِ ٱلْعَزِيزِ ٱلْحَكِيمِ ﴿١﴾ إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ فَٱعْبُدِ ٱللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ ٱلدِّينَ ﴿٢﴾ أَلَا لِلَّهِ ٱلدِّينُ ٱلْخَالِصُ ۚ وَٱلَّذِينَ ٱتَّخَذُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ أَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَآ إِلَى ٱللَّهِ زُلْفَىٰٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِى مَا هُمْ فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يَهْدِى مَنْ هُوَ كَـٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿٣﴾ ﴾

''اس کتاب کا اتارنا اللہ غالب باحکمت کی طرف سے ہے۔ یقیناً ہم نے اس کتاب

[1] القصص 28:74-75 [2] الصافات 37:85-86

کو آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے، لہٰذا آپ اللہ ہی کی عبادت کریں، اسی کے لیے بندگی کو خالص کرتے ہوئے۔ خبردار! اللہ ہی کے لیے خالص عبادت ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اولیا بنا رکھے ہیں، (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ بزرگ اللہ کے نزدیک مرتبے اور درجے میں ہماری رسائی کر دیں۔ یہ لوگ جس بارے میں اختلاف کر رہے ہیں اس کا سچا فیصلہ اللہ خود کرے گا۔ جھوٹے اور ناشکرے لوگوں کو اللہ راہ نہیں دکھاتا۔"[1]

اور مزید فرمایا:

﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ ۚ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ ۖ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿٢٨﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿٢٩﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ ۚ وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٣٠﴾﴾

"اور جس روز ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ پھر مشرکین سے کہیں گے کہ تم اور تمھارے شریک اپنی جگہ ٹھہرو۔ پھر ہم ان میں باہم پھوٹ ڈال دیں گے اور ان کے وہ شریک کہیں گے کہ تم ہماری عبادت تو کرتے ہی نہیں تھے۔ سو ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ کافی ہے گواہ کے طور پر، کہ ہم کو تمھاری عبادت کی خبر بھی نہ تھی۔ اس مقام پر ہر شخص اپنے اگلے کیے ہوئے کاموں کا امتحان کرے گا اور یہ لوگ اللہ کی طرف، جو ان کا مالک حقیقی ہے، لوٹائے جائیں گے اور جو کچھ معبود تراش رکھے تھے سب ان سے غائب ہو جائیں گے۔"[2]

اور فرمایا:

---

① الزمر 39:1-3 ② یونس 10:28-30

﴿أَلَآ إِنَّ لِلَّهِ مَن فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِي ٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ ٱلَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ شُرَكَآءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾﴾

''یاد رکھو! بے شک اللہ ہی کے لیے ہیں جو (مخلوقات) آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسرے شرکاء کی عبادت کر رہے ہیں وہ محض بے سند خیال کا اتباع کر رہے ہیں اور محض قیاسی باتیں کر رہے ہیں۔''[1]

بدعات پر عمل کرنے والوں پر اللہ کا غضب

ابوقلابہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس امت کے ہر بدعتی شخص کا قیامت کے دن یہی حال ہوگا اور واقعہ بھی وہی ہے جو ابوقلابہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔ جھوٹوں اور افترا پردازوں پر اللہ کا غضب اور ذلت نازل ہوتی رہتی ہے۔

شرک اور جملہ بدعتوں کی بنیاد جھوٹ وافترا پر ہے۔ اسی لیے توحید وسنت سے جو کوئی جس قدر زیادہ دور ہے، وہ شرک وبدعت اور افترا سے اتنا ہی قریب ہے۔ چنانچہ رافضیوں کا فرقہ، تمام باطل فرقوں سے زیادہ جھوٹا اور زیادہ شرک کرنے والا ہے۔ باطل فرقوں میں کوئی بھی ان لوگوں سے زیادہ مفتری اور توحید سے دور نہیں حتیٰ کہ یہ اللہ کی مسجدوں کو، جن میں اس کا نام یاد کیا جاتا ہے، برباد کرتے ہیں اور یہ اس طرح کہ ان میں جمعہ وجماعت قائم نہیں کرتے، لیکن ان مشاہد کو آباد کرتے ہیں جو قبروں پر قائم ہیں، جن سے اللہ اور رسول نے منع کیا ہے۔

---

[1] یونس 66:10

مساجد یا مشاہد

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مساجد کو آباد کرنے کا حکم دیا ہے نہ کہ مشاہد کو۔ فرمایا:

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن مَّنَعَ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ أَن يُذْكَرَ فِيهَا ٱسْمُهُۥ وَسَعَىٰ فِى خَرَابِهَآ﴾

''اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کے ذکر سے روکتا اور ان کی بربادی کے لیے کوشش کرتا ہے۔''[1]

اللہ تعالیٰ نے مَسَاجِدَ اللّٰہ کہا ہے نہ کہ مَشَاھِدَ اللّٰہ، بلکہ فرمایا:

﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا۟ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ شَٰهِدِينَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِم بِٱلْكُفْرِ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَٰلُهُمْ وَفِى ٱلنَّارِ هُمْ خَٰلِدُونَ ﴿١٧﴾ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَٰجِدَ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ بِٱللَّهِ وَٱلْيَوْمِ ٱلْءَاخِرِ وَأَقَامَ ٱلصَّلَوٰةَ وَءَاتَى ٱلزَّكَوٰةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا ٱللَّهَ ۖ فَعَسَىٰٓ أُو۟لَٰٓئِكَ أَن يَكُونُوا۟ مِنَ ٱلْمُهْتَدِينَ ﴿١٨﴾﴾

''ناممکن ہے کہ مشرک اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو آباد کریں حالانکہ وہ خود اپنے کفر کے آپ ہی گواہ ہیں، ان کے اعمال غارت واکارت ہیں، اور وہ دائمی طور پر جہنمی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کی رونق اور آبادی تو ان کے حصے میں ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہوں، نمازوں کے پابند ہوں، زکوٰۃ دیتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔ یہی لوگ یقیناً ہدایت یافتہ ہیں۔''[2]

لیکن مشاہد کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا۔ مشاہد وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو غیر اللہ سے ڈرتے ہیں، غیر اللہ سے آرزوئیں رکھتے ہیں اور کسی نہ کسی قسم کے شرک میں مبتلا ہیں۔ فرمایا:

﴿وَأَنَّ ٱلْمَسَٰجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا۟ مَعَ ٱللَّهِ أَحَدًا ﴿١٨﴾﴾

---

[1] البقرة 2:114 [2] التوبة 9:17-18

''اور بے شک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، لہٰذا تم اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔''[1]

مساجد للّٰہ کہا، مشاھد للّٰہ نہیں کہا۔

اسی طرح حدیث رسول میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اللہ کے لیے ایک مسجد بناتا ہے، اللہ بھی اس کے لیے جنت میں ایک گھر بناتا ہے۔''[2] یہاں بھی رسول اللہ ﷺ نے ''مسجد'' کا لفظ استعمال کیا نہ کہ مشہد کا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی احادیث ہیں جن سے اور عمل متواتر سے ثابت ہے کہ آپ نے مساجد کی تعمیر اور ان میں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے مگر مشاہد کی تعمیر کا حکم نہیں دیا، نہ کسی نبی کی قبر یا مقام پر، نہ کسی اور کی قبر یا مقام پر بلکہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں حجاز و خراسان، اور کسی بھی اسلامی ملک میں قبروں پر نہ کوئی مسجد قائم تھی اور نہ کہیں کوئی مشہد ہی موجود تھا، جس کی زیارت کی جاتی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سلف صالحین رحمہم اللہ خود نبی کریم ﷺ کی قبر پر بھی خاص طور سے دعا کرنے نہیں آتے تھے بلکہ صرف اس قدر کرتے تھے کہ مسجد میں آتے جاتے ہوئے آپ ﷺ اور آپ کے صاحبین رضی اللہ عنہما کو سلام کر لیتے تھے۔

---

[1] الجن 72:18

[2] اس حدیث سے یہ مقصود نہیں کہ آدمی بلاضرورت مسجد بنادے اور امید کرے کہ جنت میں اس کے لیے گھر بن جائے گا۔ مسجد اسی جگہ بنانی چاہیے جہاں اس کی ضرورت ہو۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہر گلی کوچے میں مسجد کھڑی کردی جائے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ایک محلے اور ایک ہی گاؤں میں کئی کئی مسجدیں بنی ہوئی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جماعت میں تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ حالانکہ مطلوب یہ ہے کہ جماعت زیادہ سے زیادہ بڑی ہو۔ بہت سے لوگ مسجدیں صرف اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان سے خود بانیوں کا نام چلے۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کو ثواب کے بجائے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بہت سے لوگ نام و نمود کے طمع یا جہالت کی وجہ سے مسجدوں کی آرائش پر اسراف کرتے ہیں، حالانکہ مسجدوں کی آرائش ممنوع ہے۔ موجودہ زمانے میں خاص طور پر ایسے اسراف سے بچنا چاہیے۔ مسجدیں ویسی بنانی چاہئیں جیسی مسجد نبوی شروع میں تھی۔ مسجدوں پر جو کچھ اسراف کرنا ہے، اسے مسلمانوں کی حالت سدھارنے پر صرف کرنا چاہیے۔

امام مالک رحمہ اللہ اور قبر نبوی پر سلام

امام مالک رحمہ اللہ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ قبر نبوی کے پاس کھڑے بھی نہیں ہونا چاہیے بلکہ سلام کر کے فوراً چلے جانا چاہیے۔ ''مبسوط'' میں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ سفر سے آنے یا جانے کے وقت کوئی مضائقہ نہیں کہ قبر نبوی کے پاس آ کر ٹھہرے، آپ پر درود پڑھے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے لیے دعا کرے۔ اس پر کسی نے کہا کہ مدینہ میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نہ تو سفر سے واپس آئے ہوئے ہیں اور نہ سفر پر جانے والے ہیں لیکن اس کے باوجود دن میں ایک یا کئی مرتبہ قبر نبوی کے پاس آتے ہیں، سلام کرتے ہیں اور دیر تک دعا کرتے رہتے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ مجھے اپنے شہر کے کسی اہلِ علم سے بھی اس کام کا مشروع ہونا نہیں پہنچا۔ اس امت کا آخر بھی اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اول درست ہو چکا ہے اور مجھے اس امت کے اوّلین افراد سے اس طرح کی کوئی بات نہیں پہنچی۔

امام مالک رحمہ اللہ اور لفظ زیارت

امام مالک رحمہ اللہ تو اس باب میں یہاں تک متشدد ہیں کہ قبر نبوی کے متعلق لفظ زیارت کا استعمال بھی پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ یہ کہنے سے بھی منع کیا ہے کہ ''میں نے قبر نبوی کی زیارت کی۔'' اور یہ صرف اس وجہ سے کہ قبر کی طرف اس لفظ (زیارت) کی نسبت انھیں پسند نہ تھی کیونکہ اس میں اہلِ کتاب سے مشابہت کی بو پائی جاتی ہے، جنھوں نے قبروں کو مسجد بنا لیا ہے۔

بہت سے لوگوں کی اصطلاح میں یہ لفظ شرک وبدعت سے آلودہ زیارت قبور کے لیے خاص ہو گیا ہے۔ چنانچہ عام قبروں پر دعا کے لیے جانے پر نہیں کہتے کہ ہم ان قبروں کی

زیارت کو جا رہے ہیں، لیکن جب بزرگوں اور پیغمبروں کی قبروں پر جاتے ہیں تو یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ نبیٔ کریم ﷺ کی کسی ایک حدیث سے بھی ثابت نہیں کہ آپ نے کسی ایک مخصوص قبر کی زیارت کا حکم دیا ہو، حتیٰ کہ کتب صحاح وسنن اور مسانید کے کسی مصنف نے بھی کوئی حدیث اس بارے میں روایت نہیں کی۔ اگر اس طرح کی حدیثیں ملتی ہیں تو صرف موضوع اور من گھڑت روایات والی کتابوں میں۔

جھوٹی حدیثیں

مثلاً یہ حدیث کہ جس کسی نے سال کے اندر میری اور میرے پدر ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی زیارت کی تو میں اس کے لیے جنت کا ضامن ہو جاؤں گا۔[1] یا یہ حدیث کہ جس نے میری وفات کے بعد میری زیارت کی، تو اس نے گویا میری زندگی میں مجھ سے ملاقات کی۔[2] یا یہ حدیث کہ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہ کی تو وہ مجھ پر ظلم کرنے والا ہے۔[3] تو یہ روایات اور اس طرح کی تمام روایات، احادیث نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر کذب و بہتان ہیں۔

بلاشبہ نبیٔ اکرم ﷺ نے ممانعت کے بعد مطلق طور پر قبروں کی زیارت کی اجازت دی

---

[1] یہ روایت بالاتفاق موضوع ہے۔ جیسا کہ امام نووی نے ذکر کیا ہے۔ ابن عراق الکنانی کہتے ہیں کہ امام نووی سے اس حدیث کے متعلق سوال ہوا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ باطل اور موضوع روایت ہے۔ اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ دیکھیے: تنزیه الشریعة: 276/2 الموضوعات: 217/2 والسلسلة الضعیفة للألبانی، حدیث: 46 و تذکرة الموضوعات للفتنی: 75

[2] یہ روایت بھی موضوع ہے۔ دیکھیے: اللآلیء المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة للسیوطی: 44/2 و سنن الدار قطنی: 2109/2 و تلخیص الحبیر لابن حجر: 266/2

[3] یہ روایت بھی موضوع ہے۔ دیکھیے: الموضوعات لابن الجوزی: 128/2 و تنزیه الشریعة: 172/2۔ تذکرة الموضوعات للفتنی: 76۔ الدرالمنثور للسیوطی: 237/1

ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا: ''میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا، لیکن اب تم زیارت کرو۔''[1] نیز صحیح بخاری میں ہے کہ فرمایا: ''میں نے اپنے پروردگار سے اجازت چاہی کہ اپنی ماں کے لیے مغفرت کی دعا کروں، تو اس نے مجھے اجازت نہ دی اور میں نے ان کی قبر کی زیارت چاہی تو دے دی، لہٰذا قبروں کی زیارت کرو کیونکہ وہ تمھیں آخرت یاد دلائیں گی۔''[2] یہ زیارت آخرت کی یاد تازہ کرنے کے لیے ہے، لہٰذا اس مقصد کے لیے کسی کافر کی قبر کی زیارت بھی جائز ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا مقصد کیا تھا؟

قبروں کے پاس نماز پڑھنا انھیں مساجد قرار دینے کا معاملہ اوپر مذکور ہو چکا، نیز یہ بھی واضح ہوگیا کہ سلف صالحین میں سے کوئی بھی اس طرح کی بات نہیں کرتا تھا۔ ہاں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی بابت منقول ہوا ہے کہ وہ تلاش کے ساتھ ان مقامات میں نماز پڑھتے تھے جہاں آپ نے نماز پڑھی تھی، حتیٰ کہ ایک جگہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا تھا اور ایک درخت کی جڑ میں پانی گرایا تھا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی یہی کیا، لیکن ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر حالت میں پیروی کرنی چاہی۔ مگر یہ نہیں کیا کہ ان مقامات کو متبرک سمجھ کر وہاں نماز پڑھی ہو یا دعا کی ہو۔

[1] صحیح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه عزوجل فی زیارة قبرأمه، حدیث: 977

[2] صحیح مسلم، الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه عزوجل فی زیارة قبر أمه، حدیث: 976

فصل 19

مقاماتِ انبیاء علیہم السلام پر عبادت

یہاں تین مسائل قابل غور ہیں:

① نبیٔ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ وقصد معلوم کیے بغیر آپ کے افعال کی ظاہری صورت کے مطابق پیروی کرنے میں مشہور اختلاف ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اوران کے ہم عصروں نے ایک بات کہی ہے، اور باقی لوگوں نے دوسری بات کہی ہے، مہاجرین وانصار کا عام مسلک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے بالکل خلاف تھا لیکن یہ چیز اس وقت ہماری بحث میں داخل نہیں۔ اسی قبیل سے یہ مسئلہ بھی ہے کہ مسافر، نماز کا وقت آجانے پر کسی ایسی جگہ نماز پڑھ لے، جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اترے تھے اور نماز پڑھی تھی۔

② یہ کہ قصدو ارادے کے ساتھ خاص نماز پڑھنے کے لیے وہاں اترے، اگرچہ نماز کا وقت بھی نہ ہو تو یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے نہ کسی اور صحابی سے، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے والد یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اس فعل سے منع کرنا ثابت ہے اور تمام مہاجرین وانصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا کرنا ثابت نہیں۔ اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسا کیا ہے، تو ان کا یہ فعل حجت نہیں ہوسکتا۔

③ یہ کہ وہ مقام راستے میں نہیں پڑتا لیکن مسافر خاص طور پر سفر کر کے وہاں نماز ودعا کے لیے جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض لوگ اس غرض سے غارِ حرا، یا غارِ ثور، یا جبل طور وغیرہ مقامات ومشاہد پر جاتے ہیں، تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس طرح کی کوئی بات بھی نہیں کرتے تھے۔ بلاشبہ جاہلیت میں قریش جبلِ حرا پر عبادت کے لیے جایا کرتے تھے۔ نبوت سے پہلے خود نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کیا ہے، بلکہ آپ پر وحی غار حرا ہی میں نازل ہوئی تھی[1] لیکن نبوت سے مشرف ہونے کے بعد پھر کبھی اس غرض سے وہاں تشریف نہیں لے گئے۔ آپ خود وہاں گئے نہ مومنین اولین جو افضل الخلائق تھے، حالانکہ اسلام کے بعد 13 برس تک مکہ میں قیام رہا، پھر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور کئی دفعہ مکہ میں آمد و رفت ہوئی، مگر کبھی غارِ حرا کا قصد نہیں کیا۔ اسی طرح آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے سابقون اولون رضی اللہ عنہم نے غارِ حرا میں یا اس طرح کے کسی اور مقام کا دعا وغیرہ کے لیے قصد نہیں کیا۔

اسی قدر نہیں بلکہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام کے سوا مکہ میں کوئی مسجد تعمیر نہیں کی۔ مکہ کی تمام مسجدیں بعد میں بنائی گئی ہیں۔ جن میں مسجد مولد کا بھی شمار ہے۔ اسی طرح آپ نے اپنی جائے پیدائش کی زیارت کا حکم دیا نہ بیعت عقبہ کی جگہ کی زیارت کا جو منیٰ کے پیچھے واقع ہے، حالانکہ اگر یہ چیز مشروع اور مستحب ہوتی، تو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ اس کی اطلاع ہوتی۔ پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا سب سے زیادہ علم ہوتا اور وہ اس عمل میں سب سے آگے ہوتے لیکن چونکہ انھوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی، لہٰذا وہ بدعت ہے۔ پس جو کوئی اسے عبادت و قربت اور اطاعت قرار دیتا ہے، تو وہ ان بزرگوں کے خلاف راستہ اختیار کرتا ہے اور دین میں ایک ایسی بات ایجاد کرتا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا۔

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامات کا یہ حکم ہے۔ مثلاً غار حرا جہاں سب سے پہلے اللہ کا پیام

---

[1] صحیح البخاری، بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ ......، حدیث: 3 و صحیح مسلم، الإیمان، باب بدء الوحی إلی رسول اللہ ﷺ، حدیث: 160

آیا[1] اور جو اسلام سے پہلے بھی عبادت گاہ تھی، یا غار ثور جس کا ذکر قرآن میں وارد ہے[2] اور جہاں آپ پر اللہ کی سکینت نازل ہوئی، جب ان مقامات کا یہ حال ہے تو دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقامات کا کیا حکم ہوگا۔ ظاہر ہے عبادت ودعا کے لیے ان کا قصد اور بھی زیادہ خلاف شریعت ہوگا اور یہ اس صورت میں جب کہ ان مقامات کی صحت ثابت ہو جائے۔ لیکن یہ بات اور بھی زیادہ مکروہ ہو جاتی ہے جب معلوم ہو جائے کہ وہ محض فرضی ہیں یا ان کی صحت ثابت نہیں کی جاسکتی۔

کسی مقام کو بوسہ دینا

اسی قبیل سے کسی مقام کو تبرک کے خیال سے مسح کرنا یا بوسہ دینا بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ نے حجر اسود کے سوا خانہ کعبہ کے کسی مقام کو بوسہ نہیں دیا۔ حتیٰ کہ مقام ابراہیم کا بھی، تو ظاہر ہے آپ کے قدم کی جگہ یا کسی اور آدمی کے قدم کی جگہ کو بوسہ دینا، مسح کرنا کیونکر جائز ہے۔ بہت سے جاہلوں نے پتھروں پر قدم کے نشان بنا رکھے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں اور لوگوں سے ان کی تعظیم کراتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے قدموں کے نشانات ہیں۔ حالانکہ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے اور ان کی صحت ثابت بھی ہو جائے تو بھی ان کا بوسہ ومسح جائز نہ ہوگا، لیکن جب کہ ان کا فرضی ہونا ثابت ہے تو اس طرح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔

مقام ابراہیم اور دوسرے مقامات

اگر کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مقام ابراہیم کو مصلیٰ قرار دینے کا حکم دیا ہے، اسی پر دوسرے

---

[1] صحیح البخاري، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ......، حديث: 3 وصحيح مسلم، الإيمان، باب بدء الوحي إلى رسول الله ﷺ، حديث: 160

[2] التوبة 9:40

مقامات کا بھی قیاس کرلینا چاہیے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ حکم صرف مقام ابراہیم کے ساتھ ہی خاص ہے،خواہ اس سے مراد وہ مقام ہو جو کعبہ کے پاس واقع ہے یا عرفہ ومزدلفہ ومنیٰ کے مشاعر ہوں۔تمام مسلمان اس بارے میں متفق ہیں کہ ان مشاعر کے خاص احکام میں دوسرے مقامات شریک نہیں۔مثلاً کعبہ کے لیے طواف خاص ہے اور دوسرے مقامات کا طواف مشروع نہیں۔پس ان مقامات کے لیے جو دعائیں خاص کردی گئی ہیں، ان پر دوسرے مقامات کو قیاس کرنا روا نہیں۔اور جو خصوصیات ان مقامات کو حاصل نہیں، وہ دوسرے مقامات کو بھی حاصل نہیں ہوں گی۔ہمارا استدلال یہ ہے کہ چونکہ ان خاص مقامات کا بوسہ ومسح بھی مشروع نہیں اس لیے دوسرے مقامات کا بوسہ ومسح بدرجہ اولیٰ مشروع نہ ہوگا اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو بات ان مقامات کے لیے مشروع ہو، وہ دوسرے مقامات کے لیے بھی مشروع ہوجائے۔

اصل اس بارے میں یہ ہے کہ جن مساجد کے لیے خصوصیت کے ساتھ سفر کا اہتمام کرنا چاہیے، وہ صرف تین ہیں۔مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی۔[1] پس نماز، دعا، ذکر، تلاوت، اعتکاف اور دیگر اعمال صالحہ کے لیے انھی تین مسجدوں کا سفر کرنا چاہیے۔ان کے سوا باتفاق علماء کسی مسجد کے لیے بھی خصوصیت کے ساتھ سفر نہیں کرنا چاہیے۔

[1] صحیح البخاری، الصوم، باب صوم یوم النحر، حدیث:1995 و صحیح مسلم، الحج، باب سفر المرأة مع محرم إلی حج وغیرہ، حدیث:(827)415(3261)

فصل 20

مسجد اقصیٰ

مسجد اقصیٰ، ان تین مسجدوں میں سے ایک ہے، جن کے لیے شدرحال یعنی سفر کرنا چاہیے۔ فتح بیت المقدس کے وقت جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس گئے تو انھوں نے صخرے پر کوڑے کا انبار دیکھا۔ جسے عیسائیوں نے یہودیوں کی عداوت میں وہاں ڈھیر کر رکھا تھا، کیونکہ یہودی صخرے کی تعظیم کرتے اور اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کپڑے میں کوڑا اٹھا کر پھینکا اور آپ کو دیکھ کر تمام مسلمانوں نے اسے صاف کرنا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے انباطی مزدوروں سے اسے صاف کرایا تھا۔ بہرحال اسے صاف کر کے آپ نے اپنی مسجد بنائی۔

لیکن مسجد اقصیٰ کو ''حرم'' نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ حرم صرف مکہ اور مدینہ ہی کے لیے خاص ہے۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بزرگی صرف مسجد اقصیٰ کی ہے نہ کہ صخرے کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے صخرے کے پاس نماز پڑھی نہ اس کا مسح کیا اور نہ اس کو بوسہ دیا۔ مسجد نبوی اور مسجد حرام، مسجد اقصیٰ سے بالاجماع افضل ہیں، لیکن حجر اسود کے سوا ان دونوں مسجدوں میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں جسے بوسہ دینا یا تبرک کے لیے ہاتھ سے چھونا مشروع ہو (سوائے بیت اللہ کے کونوں کے)۔ لہٰذا مسجد اقصیٰ کو کیونکر کوئی ایسی خصوصیت حاصل ہو سکتی ہے جو ان دونوں مسجدوں کو حاصل نہیں۔

صخرے پر تعمیر

صخرے پر پہلے کوئی عمارت نہ تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد حکام اور علماء میں سے کوئی بھی، اسے کسی عبادت کے لیے مخصوص نہیں کرتا تھا۔ صخرہ اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یزید اور معاویہ بن یزید کے زمانے تک کھلا رہا۔ یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان کی حکومت شروع ہوئی۔ اس وقت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کا بڑا زور تھا۔ لوگ حج کے لیے مکہ جاتے تھے اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے ان کی ہمدردی بڑھتی جاتی تھی، لہٰذا عبدالملک نے لوگوں کو کعبہ سے روکنے کے لیے صخرے پر قبہ تعمیر کیا اور اس پر غلاف چڑھایا، جو ہمیشہ چڑھا رہتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں میں صخرے اور بیت المقدس کی اتنی تعظیم پھیل گئی، جو پہلے انھیں معلوم نہ تھی۔ بعض لوگوں نے اس تعظیم کے بارے میں بہت سی اسرائیلیات نقل کردی ہیں، حتیٰ کہ عبدالملک کے دربار میں کعب احبار رحمہ اللہ سے روایت کیا گیا کہ اللہ نے صخرے سے کہا کہ تو میرا عرش ادنیٰ ہے۔ عروہ بن زبیر رحمہ اللہ موجود تھے، انھوں نے اعتراض کیا کہ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ [1] اور تو کہتا ہے کہ صخرہ اس کا عرش ہے۔

کعب احبار رحمہ اللہ

بعض لوگوں نے بیت المقدس اور ان کی طرح دیگر مقامات کے فضائل میں کتابیں تصنیف کی ہیں اور ان میں اہل کتاب کی روایتیں جمع کردی ہیں، حالانکہ ان روایتوں پر مسلمان اپنے دین میں ذرا بھی بھروسا نہیں کرسکتے۔ جن لوگوں سے اسرائیلیات روایت کی جاتی ہیں، ان

---

[1] البقرة 255:2

میں سب سے زیادہ قابل اعتماد کعب احبار رحمہ اللہ ہیں اور شامیوں نے ان سے بہت سی اسرائیلیات اخذ کرلی ہیں، لیکن کعب احبار رحمہ اللہ کی حالت یہ تھی کہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا ''اہل کتاب کی روایتیں بیان کرنے والوں میں ہم نے کعب سے زیادہ ثقہ نہیں دیکھا، اگرچہ کبھی کبھی ان میں بھی جھوٹ پاتے تھے۔[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اہل کتاب تمھیں کوئی بات بیان کریں تو ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔ کیونکہ وہ یا تو غلط کہہ رہے ہوں گے اور تم اس کی تصدیق کردو گے اور یا وہ سچ کہہ رہے ہوں گے اور تم اس کی تکذیب کردو گے۔''[2]

یہ معصوم امت جو کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی، اس کی شریعت عجیب طور سے محفوظ و مامون رہی ہے۔ بڑے بڑے تابعی مثلاً عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، ابوالعالیہ وغیرہم رحمہم اللہ بھی جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحابی کے واسطے کے بغیر روایت کرتے ہیں تو باوجود ان کی جلالت، شان اور بزرگی کے اہلِ علم ان کی ایسی مرسل حدیثیں قبول کرنے میں تامل کرتے ہیں، چنانچہ بعض اہل علم نے تو قطعی طور پر مراسیل کو مسترد کردیا ہے اور بعض علماء شروط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ یہ برتاؤ ان لوگوں کی احادیث کے ساتھ ہے جن کے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مابین ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین واسطے ہیں۔ ظاہر ہے اب آج کل کے زمانے میں جو

---

[1] صحیح البخاری، الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لاتسألوا أهل الکتاب عن شيء، حدیث: 7361۔ کعب الأحبار رحمہ اللہ خود جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے تھے، بلکہ اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نقل کردہ بعض خبریں غلط ہوتی تھیں۔ دیکھیے: فتح الباری، 709/13

[2] مصنف نے یعنی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے متن میں صحیح بخاری کا حوالہ دیا ہے جبکہ یہ عبارت اور سیاق جسے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، وہ صحیح بخاری میں نہیں ہے بلکہ صحیح بخاری میں تو صرف اتنی عبارت ہے کہ ''تم اہل کتاب کی تصدیق کرو نہ تکذیب، بلکہ کہو کہ ہم اللہ کے ساتھ اور اس چیز کے ساتھ ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی۔'' صحیح البخاری، التفسیر، تفسیر سورۃ البقرۃ، باب: 11، حدیث: 4485۔ البتہ مسند احمد میں اسی مفہوم کی روایت موجود ہے اور اس کی سند بھی جید ہے۔ دیکھیے: مسند أحمد: 136/4

لوگ اپنی کتابوں میں مرسل[1] حدیثیں درج کر دیا کرتے ہیں، باتفاق علماء انھیں اس وقت تک صحیح نہیں قرار دینا چاہیے، جب تک معلوم نہ ہو جائے کہ وہ ایسے محدثین سے نقل کی گئی ہیں جو ہمیشہ صحیح حدیثیں ہی روایت کرتے ہیں۔

معلوم ہے کہ صحابہ وتابعین نے نبیٔ کریم ﷺ کے بعد فتوحات حاصل کیں اور وہ شام، عراق اور مصر وغیرہ میں مقیم ہو گئے۔ ظاہر ہے وہ بعد کے لوگوں سے کہیں زیادہ دین کو جاننے والے اور اس کی پیروی کرنے والے تھے، لیکن انھوں نے کبھی بھی ان مقامات کی تعظیم نہیں کی، جن کی اس وقت لوگ کر رہے ہیں۔ ممکن ہے ان کے بعد کسی نیک اور متدیّن آدمی نے ان مقامات کی تعظیم کی ہو، لیکن مسلمانوں کو صحابہ وتابعین کی پیروی کرنی چاہیے، نہ کہ کسی دوسرے آدمی کی۔

معراج کے بارے میں بعض جھوٹی روایات

صحیح مسلم میں ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ جب معراج کی رات بیت المقدس تشریف لے گئے تو وہاں دو رکعت نماز پڑھی،[2] اس کے سوا کہیں نماز پڑھی نہ کسی جگہ کی زیارت کی۔ معراج کے بارے میں احادیث میں سے بعض صحیح ہیں بعض موضوع اور جھوٹی ہیں۔ مثلاً یہ روایت کہ نبیٔ اکرم ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے۔ اتریے، اور نماز پڑھیے۔

ان روایتوں میں ایک عجیب بات یہ بیان کی گئی ہے کہ مدینہ میں بھی اسی طرح آپ کو اتارا گیا اور آپ نے مسجد کے مقام پر نماز پڑھی، حالانکہ اس وقت مسجد موجود ہی نہ تھی۔ ہجرت کے

---

[1] مرسل اس حدیث کو کہتے ہیں جو صحابی کے واسطے کے بغیر براہ راست نبیٔ اکرم ﷺ سے روایت کی جائے۔

[2] صحیح مسلم، الإیمان، باب الإسراء برسول اللہ ﷺ إلی السماوات، حدیث: 162

وقت نبی کریم ﷺ وہاں اس لیے اتر پڑے تھے کہ آپ کی اونٹنی وہیں بیٹھ گئی تھی، یہ اور اس طرح کی بعض روایتیں باتفاق جملہ علماء سراسر کذب و بہتان ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر

بیت لحم عیسائیوں کا گرجا گھر ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اس کی زیارت کوئی فضیلت نہیں رکھتی، خواہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقام ولادت ہے یا نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر پر بھی صحابہ وتابعین نماز ودعا کے لیے نہیں جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ملک شام میں تشریف لائے اور بعد ازاں بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے شام ہی میں سکونت اختیار کرلی، مگر کسی نے بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کی۔

چوتھی صدی کے اواخر میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ شام ومصر پر روافض کی حکومت تھی جو ایک مغلوب قوم ہے، وہ صحیح عقل رکھتی ہے نہ مقبول دین اور نہ ہی منصور دنیا۔ انھی لوگوں سے عیسائیوں نے یہ مقام چھینا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حجرے میں نقب لگا کر دروازہ بنا دیا، اس وقت سے یہ جگہ عبادت گاہ بنادی گئی ہے۔ پس یہ فعل عیسائیوں کا ہے، نہ کہ سلف صالحین اور خیار امت رحمہم اللہ کا۔

مساجد کا حکم

مسلمانوں کے دین کی اصل یہ ہے کہ عبادت کے لیے مسجدوں کے سوا کسی دوسری جگہ کو خاص نہ کیا جائے۔ مشرکین اور اہلِ کتاب بلاشبہ دوسرے مقامات کی تعظیم عبادت کے خیال سے کرتے تھے، مگر اسلام اسے مٹانے اور دور کرنے آیا ہے۔

تمام مسجدیں عبادات میں مشترک ہیں۔ جو عبادت ایک مسجد میں کی جاتی ہے۔ وہی ہر مسجد میں کی جاسکتی ہے بجز مسجد حرام کے، جسے طواف وغیرہ کی خصوصیت حاصل ہے۔ اس مسجد کی بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ دوسری مساجد ان خصوصیات میں اس مسجد کی شریک نہیں ہوسکتیں۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کسی دوسری مسجد کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔

مسجد نبوی

رہ گئی مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ تو جو عبادتیں ان دونوں مساجد میں انجام دی جاسکتی ہیں، وہی عبادات تمام مسجدوں میں کی جاسکتی ہیں۔ مسح، بوسہ اور طواف وغیرہ ان میں جائز نہیں، جو کہ دوسری مساجد میں بھی جائز نہیں۔ البتہ یہ دونوں مساجد مسجد حرام کے بعد تمام مساجد سے افضل ضرور ہیں۔ ان میں نماز کا ثواب زیادہ ہے۔ مسجد نبوی کے بارے میں صحیحین کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اس مسجد میں ایک نماز، مسجد حرام کے علاوہ تمام دوسری

مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔"[1] صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک عورت بیمار ہوئی اور اس نے منت مانی کہ اگر اللہ نے مجھے شفا عطا فرمائی تو میں بیت المقدس میں جا کر نماز پڑھوں گی۔ جب وہ اچھی ہوئی تو سفر کے لیے تیار ہو کر ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس رخصت ہونے آئی۔ انھوں نے فرمایا کہ بیٹھو اور کھانا کھالو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں نماز پڑھ لینا، کیونکہ میں نے آپ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "مسجد کعبہ کے علاوہ اس مسجد (مسجد نبوی) میں ایک نماز، دوسری مسجدوں کی ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔"[2] مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میری اس مسجد میں نماز، مسجد حرام کے علاوہ تمام مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے اور مسجد حرام میں ایک نماز میری مسجد میں سو نمازوں سے افضل ہے۔"[3]

اعتکاف

اسی لیے شریعت نے مسجدوں میں اعتکاف کا حکم دیا ہے، نہ کہ غاروں وغیرہ میں۔ جاہلیت میں دستور تھا کہ لوگ غار حرا میں معتکف ہوا کرتے تھے۔ اعتکاف، دین اسلام میں ایک ایسی عبادت ہے جو مسجدوں ہی میں انجام دی جا سکتی ہے۔ درخت، پتھر، بت، قبر یا کسی اور ایسے ہی مقام پر، جسے متبرک سمجھا جاتا ہے، وہاں اعتکاف اور مجاورت مسلمانوں کا نہیں بلکہ مشرکوں کا

---

[1] صحیح البخاری، فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، باب فضل الصلاۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ، حدیث:1190 و صحیح مسلم، الحج، باب فضل الصلاۃ بمسجدی مکۃ والمدینۃ، حدیث:1394

[2] صحیح مسلم، الحج، باب فضل الصلاۃ بمسجدی مکۃ والمدینۃ، حدیث:1396

[3] مسند أحمد: 5/4۔ اس کی سند صحیح ہے۔

دین ہے۔ مومنین کا اعتکاف مساجد میں اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کی عبادت کے لیے ہوتا ہے اور مشرکین کا اعتکاف باطل معبودوں کی پرستش کے لیے ہوتا ہے۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں، امیدیں رکھتے ہیں اور جنھیں وہ شریک و شفیع بتاتے ہیں۔ کوئی مشرک بھی اس بات کا قائل نہ تھا کہ دنیا کے دو خالق ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا اس کے برابر کا اللہ تعالیٰ موجود ہے، بلکہ وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے کہ آسمان و زمین کا خالق ایک ہی ہے۔ جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی نسبت بیان فرمایا ہے:

﴿قُل لِّمَنِ ٱلۡأَرۡضُ وَمَن فِيهَآ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿٨٤﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِۚ قُلۡ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٨٥﴾ قُلۡ مَن رَّبُّ ٱلسَّمَٰوَٰتِ ٱلسَّبۡعِ وَرَبُّ ٱلۡعَرۡشِ ٱلۡعَظِيمِ ﴿٨٦﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِۚ قُلۡ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٨٧﴾ قُلۡ مَنۢ بِيَدِهِۦ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيۡءٖ وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيۡهِ إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿٨٨﴾ سَيَقُولُونَ لِلَّهِۚ قُلۡ فَأَنَّىٰ تُسۡحَرُونَ ﴿٨٩﴾﴾

''پوچھیے تو سہی کہ زمین اور اس کی کل چیزیں کس کی ہیں؟ (بتلاؤ) اگر جانتے ہو؟ تو وہ فوراً جواب دیں گے کہ اللہ کی۔ کہہ دیجیے کہ پھر تم نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے؟ دریافت کیجیے کہ ساتوں آسمانوں کا اور بہت باعظمت عرش کا رب کون ہے؟ وہ لوگ جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہہ دیجیے کہ پھر تم کیوں نہیں ڈرتے؟ پوچھیے کہ تمام چیزوں کا اختیار کس کے ہاتھ میں ہے جو کہ پناہ بھی دیتا ہے اور جس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دیا جاتا، اگر تم جانتے ہو (تو بتلا دو؟) وہ یہی جواب دیں گے کہ اللہ ہی ہے۔ کہہ دیجیے پھر تم کدھر سے جادو کر دیے جاتے ہو؟''[1]

اور وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے: لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ، تَمْلِكُهٗ

[1] المؤمنون 23:84-89

وَمَامَلَكَ ''میں حاضر ہوں اے رب تیرا کوئی شریک نہیں، بجز ایک شریک کے جو تیرا ہی ہے تو اس کا بھی مالک ہے اور اس کی ملکیت کا بھی مالک ہے۔''

مشرکین کے وسیلے

وہ صرف یہ کرتے تھے کہ اپنے معبودوں کو وسیلے اور واسطے قرار دیتے تھے جو ان کے خیال میں انھیں اللہ سے قریب کرنے والے اور ان کی شفاعت کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾

''اور جن لوگوں نے اس کے سوا اولیا بنا رکھے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے زیادہ قریب کردیں۔''[1]

مزید فرمایا:

﴿أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاءَ ۚ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئًا وَلَا يَعْقِلُونَ ﴿٤٣﴾ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا ۖ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٤٤﴾﴾

''کیا ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں کو سفارشی مقرر کر رکھا ہے؟ آپ کہہ دیجیے اگرچہ وہ کچھ بھی اختیار نہ رکھتے ہوں اور نہ عقل رکھتے ہوں۔ کہہ دیجیے کہ تمام سفارش کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ تمام آسمانوں اور زمین کا راج اور بادشاہت اسی کے لیے ہے پھر تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''[2]

---

[1] الزمر 3:39 [2] الزمر 43:39-44

اور فرمایا:

﴿وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰٓؤُلَآءِ شُفَعَٰٓؤُنَا عِندَ ٱللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّـُٔونَ ٱللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَلَا فِى ٱلْأَرْضِ ۚ سُبْحَٰنَهُۥ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿١٨﴾﴾

"اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں، جو ان کو ضرر پہنچا سکیں نہ نفع پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں، آسمانوں میں نہ زمین میں؟ وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔"[1]

اور سورۂ یٰسٓ میں ایک صالح شخص کا قول نقل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا لِىَ لَآ أَعْبُدُ ٱلَّذِى فَطَرَنِى وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٢﴾ ءَأَتَّخِذُ مِن دُونِهِۦٓ ءَالِهَةً إِن يُرِدْنِ ٱلرَّحْمَٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّى شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَلَا يُنقِذُونِ ﴿٢٣﴾ إِنِّىٓ إِذًا لَّفِى ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٢٤﴾ إِنِّىٓ ءَامَنتُ بِرَبِّكُمْ فَٱسْمَعُونِ ﴿٢٥﴾﴾

"اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا؟ اور تم سب اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ کیا میں اسے چھوڑ کر ایسوں کو معبود بناؤں کہ اگر اللہ رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی سفارش مجھے کچھ نفع نہ پہنچا سکے اور نہ وہ مجھے بچا سکیں؟ پھر تو میں یقیناً کھلی گمراہی میں ہوں۔ میری سنو! میں تو سچے دل سے تم سب کے رب پر ایمان لا چکا۔"[2]

اور فرمایا:

﴿وَأَنذِرْ بِهِ ٱلَّذِينَ يَخَافُونَ أَن يُحْشَرُوٓا۟ إِلَىٰ رَبِّهِمْ ۙ لَيْسَ لَهُم مِّن دُونِهِۦ وَلِىٌّ

---

[1] یونس 18:10 [2] یٰسٓ 36:22-25

﴿وَلَا شَفِيعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٥١﴾﴾

''اوراس (قرآن) کے ذریعے سے ایسے لوگوں کوڈرایے جواس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس ایسی حالت میں جمع کیے جائیں گے کہ اللہ کے سوا کوئی ان کا مددگار اور نہ کوئی شفیع ہوگا، اس امید پر کہ وہ ڈر جائیں۔''[1]

---

[1] الأنعام 51:6

فصل 22

شفاعت

شفاعت کے بارے میں لوگوں کے تین فرقے ہوگئے ہیں:

① مشرکین، اہل کتاب میں سے ان کی موافقت کرنے والے بدعتی اور اس امت کے بدعتی اس شفاعت کے قائل ہیں جس کی قرآن کریم نے تردید کی ہے۔

② خوارج اور معتزلہ نے کبائر کے مرتکب حضرات کے حق میں نبیٔ کریم ﷺ کی شفاعت سے انکار کیا ہے، بلکہ بعض باطل فرقے سرے سے شفاعت ودعا کے قائل ہی نہیں۔ وہ قرآن پاک کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں:

﴿مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ﴾

''اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس میں نہ تجارت ہے، نہ دوستی اور نہ شفاعت۔''[1]

اور مزید فرمایا:

﴿مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿١٨﴾﴾

''ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے۔''[2]

③ لیکن سلف صالحین، ائمہ دین اور ان کی راہ پر چلنے والے علمائے اہل سنت والجماعت رحمہم اللہ، احادیث کی بنا پر نبیٔ کریم ﷺ کی شفاعت کے قائل ہیں، صرف آپ کی نہیں بلکہ

① البقرة 254:2 ② المؤمن 18:40

دوسرے انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی شفاعت کے بھی۔ ان کا اعتقاد ہے کہ کوئی موحد ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہیں رہے گا۔ وہ احادیث کی بنا پر قائل ہیں کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کی شفاعت ودعا سے مستفید ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شفیع، اللہ سے دعا والتجا کرے گا لیکن وہاں شفاعت اس کے حکم کے بغیر مفید نہ ہو سکے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَن ذَا ٱلَّذِى يَشْفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذْنِهِۦ﴾

''کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے سامنے شفاعت کر سکے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ٱرْتَضَىٰ﴾

''وہ نہیں شفاعت کرتے مگر صرف اس کے لیے جس سے اللہ راضی ہو۔''[2]

مزید فرمایا:

﴿وَكَم مِّن مَّلَكٍ فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ لَا تُغْنِى شَفَٰعَتُهُمْ شَيْـًٔا إِلَّا مِنۢ بَعْدِ أَن يَأْذَنَ ٱللَّهُ لِمَن يَشَآءُ وَيَرْضَىٰٓ ﴿٢٦﴾﴾

''آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی شفاعت کچھ بھی کام نہیں آتی لیکن یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خوشی اور اپنی چاہت سے جس کے لیے چاہے اجازت دے دے۔''[3]

حدیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام سے شفاعت کی درخواست کی جائے گی مگر وہ لوگوں کو اللہ کے بندے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیج دیں گے جن کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

① البقرة 255:2

② الأنبياء 28:21 ③ النجم 26:53

’’اس وقت میں اپنے رب کے حضور جاؤں گا، جب اس کا جلوہ ہوگا تو سجدے میں گر پڑوں گا اور پروردگار کی حمد وثنا اس طریقے سے کرنے لگوں گا، جو اسی وقت مجھے بتایا جائے گا اور جو اس وقت مجھے معلوم نہیں۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

’’اے محمد (ﷺ)! سر اٹھایئے اور کہیے، آپ کی عرض سنی جائے گی۔ مانگیے! آپ کی درخواست منظور کی جائے گی۔ شفاعت کیجیے! آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس وقت میں پکار اٹھوں گا کہ اے میرے رب! میری امت؟ اے میرے رب! میری امت؟ اس پر وہ میرے لیے حد مقرر کردے گا اور میں اس حد کے مطابق لوگوں کو جنت میں داخل کردوں گا۔‘‘[1]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِۦ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ﴿٥٦﴾ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُۥ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُۥٓ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ﴿٥٧﴾﴾

’’کہہ دیجیے: پکارو جنھیں تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو، نہ تو وہ تم سے کسی تکلیف کو ہٹانے کا کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ (اسے) بدلنے ہی کا، جنھیں یہ (مشرک) لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں سے کون (اللہ سے) قریب تر (ہوسکتا) ہے، اور وہ اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بلاشبہ آپ کے رب کا عذاب ڈرنے ہی کی چیز ہے۔‘‘[2]

---

[1] صحيح البخاري، التفسير، تفسير سورة البقرة، باب 1، حديث: 4476 و صحيح مسلم، الإيمان، باب أدنى أهل الجنة منزلة فيها، حديث: 193

[2] الإسراء 17:56-57

سلف صالحین کی ایک جماعت نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ کچھ لوگ عزیر علیہ السلام [1] اور مسیح علیہ السلام اور فرشتوں کو پکارتے تھے، ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن لوگوں کو تم پکارتے ہو وہ خود بھی تقرب الٰہی کے محتاج، اس کی رحمت کے آرزومند اور اس کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔

شفاعت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہوگا؟

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کے دن آپ کی شفاعت سے کون سب سے زیادہ بامراد اور کامیاب ہوگا؟ فرمایا: ''میری شفاعت سے سب سے زیادہ بہرہ مند وہ ہوگا جس نے اخلاص کے ساتھ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه'' کہا ہوگا۔'' [2]

پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ جس کا اخلاص جتنا زیادہ ہوگا وہ شفاعت کا اتنا ہی زیادہ مستحق ہوگا لیکن جس کا دل کسی مخلوق سے لٹک چکا ہے، وہ اس سے آرزو رکھتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے تو وہ شفاعت سے بہت دور ہوگا۔

جب آپ کسی آدمی کے پاس سفارش کے لیے جاتے ہیں تو پہلے سے اس کی اجازت حاصل نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ آدمی کسی بات میں تمھارا محتاج یا کسی وجہ سے تم سے خائف ہے، لہٰذا تم سمجھتے ہو کہ وہ تمھاری سفارش پر توجہ کرنے کے لیے مجبور ہو جائے گا لیکن اللہ تو سب سے بے نیاز ہے، وہی سب کا کارساز اور فرماں روا ہے، لہٰذا

---

[1] خود یہودی بڑی سختی سے انکار کرتے ہیں کہ انھوں نے کبھی بھی عزیر نبی کو الوہیت سے متصف کیا ہو، تاریخ سے بھی اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کو لے کر مخالفین، اسلام پر اعتراض کیا کرتے تھے لیکن اب علمائے مصر نے ثابت کر دیا ہے کہ یہودیوں نے صحرائے سینا میں جس عجل یا بچھڑے کی پرستش کی تھی وہ دراصل مصری دیوتا اوزیریس کی مورت تھی۔ عزیر درحقیقت اسی اوزیریس کا معرب ہے۔

[2] صحيح البخاري، الرقاق، باب صفة الجنة والنار، حديث :6570

اس کے یہاں سفارش اور شفاعت اس کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ خود ہی شفیع کو شفاعت کی اجازت دیتا ہے اور خود ہی اسے قبول کر لیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح دعا کرنے والے کے دل میں دعا کا خیال پیدا کر دیتا ہے، پھر اس کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ پس معاملہ سراسر اسی کے اختیار میں ہے۔

غور کرنا چاہیے کہ اگر آدمی دوسرے آدمی کو اپنا شفیع بنائے تو ممکن ہے کہ وہ آدمی شفاعت کرنے کو ناپسند کرے، خواہ پھر شفاعت کر بھی دے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے لیے نہ تو سفارش کی اجازت دے گا جس کے لیے ناپسند کرتا ہوگا اور نہ ہی اس کی سفارش کو قبول کرے گا۔

افضل ترین مخلوق حضرت محمد ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، مگر حضرت محمد ﷺ نے اپنے محبوب چچا ابوطالب کے حق میں دعا کرنے سے پرہیز کیا حالانکہ ان سے فرما چکے تھے کہ میں آپ کے لیے اس وقت تک مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا جب تک مجھے اس سے منع نہ کر دیا جائے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی دعا

بلاشبہ آپ ﷺ نے بعض منافقوں پر نماز جنازہ پڑھی اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگی،[2] لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فعل سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ﴾

''ان میں سے کوئی مر جائے تو آپ اس پر ہرگز نماز جنازہ نہ پڑھیں اور نہ اس کی قبر

---

[1] صحیح البخاری، الجنائز، باب إذا قال المشرك عند الموت: لا إله إلا الله ، حدیث: 1360 وصحیح مسلم، الإیمان باب الدلیل علی صحة إسلام من حضره الموت، حدیث: 24

[2] صحیح البخاری، التفسیر، تفسیر سورة براءة، باب: 13، حدیث :4672

پر کھڑے ہوں۔"[1]

اور فرمایا:

﴿ٱسْتَغْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَهُمْ﴾

"تو ان کے لیے استغفار کر یا نہ کر۔ اگر تو ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرے تو بھی اللہ انھیں ہرگز نہ بخشے گا۔"[2]

اس وحی کے بعد آپ نے فرمایا: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ دعا کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"[3] اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَن يَغْفِرَ ٱللَّهُ لَهُمْ﴾

"چاہے تم ان لوگوں کے حق میں مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، اللہ انھیں ہرگز نہ بخشے گا۔"[3]

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ دیکھو۔ انھوں نے اپنے والد سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں گے لیکن جب انھیں معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، تو اس سے براءت کا اعلان کر دیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں مذکور ہے:

﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَن يَسْتَغْفِرُوا۟ لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوٓا۟ أُو۟لِى قُرْبَىٰ مِنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ أَصْحَٰبُ ٱلْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ ٱسْتِغْفَارُ إِبْرَٰهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَآ إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُۥٓ

---

[1] التوبة 80:9 [2] التوبة 80:9

[3] صحيح البخاري، التفسير، تفسير سورة براءة، باب: 12، حديث: 4671

[3] المنافقون 6:63

أَنَّهُۥ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾

''پیغمبر کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی ہوں، اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں۔ اور ابراہیم (علیہ السلام) کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت مانگنا، صرف اس وعدے کی وجہ سے تھا جو انھوں نے اس سے کر لیا تھا پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بے تعلق ہو گئے۔ یقیناً ابراہیم (علیہ السلام) بڑے رحیم المزاج اور حلیم الطبع تھے۔''[1]

① التوبة 9:113-114

فصل 23

اللہ تعالیٰ اور بندے کے حقوق

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بعض حقوق ہیں جن میں وہ کسی کو شریک نہیں کرتا اور انبیاء علیہم السلام کے بھی حقوق ہیں جن میں وہ دوسرے آدمیوں کو شریک نہیں بناتا، اور مومنین کے حقوق باہم مشترک ہیں۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے اونٹ پر سوار تھا، آپ نے فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔'' پھر فرمایا: ''اے معاذ! کیا تو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ فرمایا: ''اگر وہ ایسا کریں تو بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ وہ انھیں عذاب نہ دے۔''[1]

پس اللہ تعالیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ یہی اصل توحید ہے، جسے دے کر اس نے تمام رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن قَبۡلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِيٓ إِلَيۡهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠

---

[1] صحيح البخاري، اللباس، باب إرداف الرجل خلف الرجل، حديث : 5967 وصحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من مات على التوحيد دخل الجنة قطعا، حديث:30

فَاعْبُدُونِ ﴿٢٥﴾

”تجھ سے پہلے جو بھی رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں، پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔“ ①

اور فرمایا:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾

”اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔“ ②

اس کے خاص حقوق میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کے سوا کسی سے خوف نہ کھایا جائے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٥٢﴾﴾

”جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کریں، خوف الٰہی رکھیں اور اس کا تقویٰ اختیار کریں، وہی نجات پانے والے ہیں۔“ ③

اس آیت میں اطاعت، اللہ اور رسول دونوں کے لیے لازم قرار دی ہے لیکن خشیت وتقویٰ صرف اللہ واحد کے لیے رکھا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ﴿٥٩﴾﴾

”اگر یہ لوگ اللہ اور رسول کے دیے ہوئے پر خوش رہتے اور کہہ دیتے کہ ہمیں اللہ

---

① الأنبياء 25:21

② النحل 36:16 ③ النور 52:24

کافی ہے۔عنقریب اللہ ہمیں اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی۔ ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔''[1]

اس آیت میں عطا کو اللہ اور رسول دونوں میں مشترک رکھا ہے لیکن رغبت صرف اللہ کی طرف بیان کی ہے۔جیسا کہ دوسری آیت میں رسول کی عطا کے متعلق فرمایا:

﴿وَمَآ ءَاتَىٰكُمُ ٱلرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَىٰكُمْ عَنْهُ فَٱنتَهُوا۟﴾

''رسول جو کچھ تمھیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے باز رہو۔''[2]

پس حلال وہی ہے جو رسول نے بتایا ہے اور حرام بھی وہی ہے جسے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین وہی ہے جو رسول نے مقرر کر دیا ہے لیکن تکیہ و بھروسا صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی پر ہونا چاہیے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ﴾ ''یعنی اللہ ہی ہمیں کافی ہے۔'' یہ نہیں کہا کہ ﴿حَسْبُنَا الرَّسُوْلُ﴾ یہی بات ایک دوسری آیت میں فرمائی ہے:

﴿ٱلَّذِينَ قَالَ لَهُمُ ٱلنَّاسُ إِنَّ ٱلنَّاسَ قَدْ جَمَعُوا۟ لَكُمْ فَٱخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَـٰنًا وَقَالُوا۟ حَسْبُنَا ٱللَّهُ وَنِعْمَ ٱلْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾﴾

''وہ لوگ کہ جب ان سے لوگوں نے کہا کہ کافروں نے تمھارے مقابلے پر لشکر جمع کر لیے ہیں، لہٰذا تم ان سے خوف کھاؤ تو اس بات نے انھیں ایمان میں اور بڑھایا اور وہ کہنے لگے کہ ہمیں اللہ ہی کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔''[3]

پھر فرمایا:

﴿سَيُؤْتِينَا ٱللَّهُ مِن فَضْلِهِۦ وَرَسُولُهُۥٓ إِنَّآ إِلَى ٱللَّهِ رَٰغِبُونَ ﴿٥٩﴾﴾

''عنقریب ہمیں اللہ اپنے فضل سے دے گا اور اس کا رسول بھی، بے شک ہم تو اللہ ہی

---

[1] التوبة 59:9

[2] الحشر 7:59 [3] آل عمران 173:3

کی طرف رغبت کرنے والے ہیں۔''[1]

اس میں فضل کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہے اور عطا میں رسول کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ مباح اتنا ہی ہے جتنا رسول دے دے، یہ روا نہیں کہ آدمی جتنا لے سکتا ہو لے لے، پھر فرمایا: ﴿اِنَّا اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ﴾ اس آیت میں رغبت صرف اللہ کی طرف رکھی ہے، کسی اور کی طرف نہیں رکھی، جیسا کہ فرمایا:

﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۞ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ۞﴾

''پس جب تو فارغ ہو تو عبادت میں محنت کر اور اپنے پروردگار ہی کی طرف رغبت کر۔''[2]

کون لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہوں گے؟

تمام مسائل میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رغبت ورجوع رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہرگز کسی مخلوق کو حکم نہیں دیا کہ کسی دوسری مخلوق سے کوئی التجا کرے البتہ بعض معاملات میں اسے مباح قرار دیا ہے لیکن حکم نہیں دیا۔ لہٰذا بندے کے لیے افضل یہی ہے کہ اللہ کے سوا کبھی کسی سے سوال نہ کرے، جیسا کہ صحیح حدیث میں ان لوگوں کے اوصاف کا ذکر ہے جو بغیر حساب جنت میں داخل کردیے جائیں گے ''یہ وہ لوگ ہیں جو جھاڑ پھونک نہیں کراتے، داغ نہیں لگواتے، بدشگونی نہیں لیتے اور صرف اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔''[3] پس ان کی ایک صفت یہ بتائی کہ وہ اپنے لیے جھاڑ پھونک نہیں کراتے لیکن یہ نہیں کہا کہ وہ خود بھی دم نہیں

---

[1] التوبة 59:9 [2] الانشراح 94:7-8

[3] صحیح البخاري، الطب، باب من اكتوى أو كوى غيره......، حديث:5705 و صحيح مسلم، الإيمان، باب الدليل على دخول طوائف من المسلمين، حديث:218

کرتے، اگرچہ صحیح مسلم کے بعض طُرق میں یہ لفظ بھی آیا ہے کہ خود بھی دم نہیں کرتے[1] لیکن وہ غلط ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو دم کرتے تھے مگر کبھی کسی سے اپنی ذات کے لیے کسی سے دم کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور آپ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا: ''جب تو مانگنا چاہے تو صرف اللہ سے مانگ اور جب مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہو تو صرف اللہ کی مدد کا طالب ہو۔''[2] پس وہ ایک ہی ہے جس پر توکل کرنا چاہیے، جس سے فریاد کرنی چاہیے، جس سے خوف کھانا چاہیے، جس سے امید رکھنی چاہیے، جس کی عبادت کرنی چاہیے، جس کی طرف دلوں کو رجوع کرنا چاہیے، اس کے سوا ہرگز کسی کو کوئی طاقت وقوت حاصل نہیں، اس سے پناہ اگر مل سکتی ہے تو خود اسی کے سایہ رحمت میں مل سکتی ہے۔ تمام قرآن اس اصل کو ثابت کر رہا ہے۔

اطاعت رسول

اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنی چاہیے، آپ سے محبت کرنی چاہیے، آپ کے حکم پر خوش دلی سے مطمئن ہونا چاہیے، آپ کی تعظیم وتوقیر کرنی چاہیے، آپ کی پیروی کرنی چاہیے آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت پر ایمان رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَّن يُطِعِ ٱلرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ ٱللَّهَ ۖ وَمَن تَوَلَّىٰ فَمَآ أَرْسَلْنَٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا﴾

''جس نے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جو منہ پھیرے تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔''[3]

---

[1] صحیح مسلم، الإیمان، باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین ......، حدیث:220

[2] جامع الترمذی، صفة القیامة، باب 59 حدیث حنظلة ......،حدیث:2516و مسند أحمد: 307,303,293/1۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

[3] النساء 80:4

اور فرمایا:

﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ ٱللَّهِ﴾

’’ہم نے ہر رسول اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔‘‘[1]

اور فرمایا:

﴿قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ وَأَزْوَٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَٰلٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَجِهَادٍ فِى سَبِيلِهِۦ فَتَرَبَّصُوا۟ حَتَّىٰ يَأْتِىَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿٢٤﴾﴾

’’آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارے کنبے قبیلے اور تمھارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنھیں تم پسند کرتے ہو، اگر یہ تمھیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے بھی زیادہ عزیز ہیں تو تم اللہ کے حکم سے عذاب کے آنے کا انتظار کرو۔ اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔‘‘[2]

حلاوتِ ایمان کیسے حاصل ہوگی؟

صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جس شخص میں تین صفات ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت اور مٹھاس پائے گا: ’’جسے اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں، جو کسی آدمی سے صرف اللہ کی رضا کے لیے محبت کرتا ہو، اور جو کفر سے نجات پا جانے کے بعد

---

① النسآء 64:4

② التوبۃ 24:9

اس میں واپسی اس قدر ناپسند کرتا ہو کہ جتنا آگ میں گرنا ناپسند کرتا ہے۔"[1]

اور فرمایا: "قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم اس وقت تک کامل ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ میں تمھیں تمھاری اولاد سے، تمھارے والدین سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"[2]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرض کیا: اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں بجز اپنی جان کے۔ فرمایا: "نہیں عمر! یہاں تک کہ میں تیری جان سے بھی زیادہ تجھے محبوب ہوں۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کے رسول! اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے ہیں۔ آپ نے جواب دیا: "ہاں! اے عمر!"[3]

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾

"اے پیغمبر! کہہ دو کہ اگر تم لوگ واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ معاف کر دے گا۔"[4]

اور فرمایا:

﴿إِنَّآ أَرْسَلْنَٰكَ شَٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝﴾

---

① صحیح البخاری، الإیمان، باب حلاوۃ الإیمان، حدیث:16و صحیح مسلم، الإیمان، باب بیان خصال من اتَّصَفَ بهنَّ ......الخ، حدیث: 43

② صحیح البخاری، الإیمان، باب حب الرسول ﷺ من الإیمان، حدیث: 15و صحیح مسلم، الإیمان، باب وجوب محبة رسول اللہ ﷺ ......، حدیث:44

③ صحیح البخاری، الأیمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی ﷺ،حدیث:6632

④ آل عمران 31:3

''یقیناً ہم نے تجھے گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کا ادب کرو اور صبح شام اللہ کی پاکی بیان کرو۔''[1]

اس میں تشریح کردی گئی کہ ایمان، اللہ اور رسول دونوں پر ہونا چاہیے، تعظیم و توقیر رسول اللہ ﷺ کے لیے ہونی چاہیے اور تسبیح صرف اللہ واحد کے لیے ہونی چاہیے۔

① الفتح 48:8-9

فصل 24

رسالتِ محمدیہ کا اولین مقصد

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو توحید کے اثبات وقیام اور ہر لحاظ سے ابطال شرک کے لیے بھیجا اور عام بول چال میں بھی یہ بات ناپسند فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ کسی دوسرے کا ذکر کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: ''کوئی یہ نہ کہے کہ ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ'' ''اللہ جو چاہے اور جو محمد (ﷺ) چاہیں۔'' بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ مُحَمَّدٌ'' ''اللہ جو چاہے پھر اس کے بعد جو محمد (ﷺ) چاہیں۔''[1]

ایک شخص نے آپ سے کہا کہ مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ ''جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔'' آپ نے اسے یہ کہنے سے منع کیا اور فرمایا: ''کیا تو مجھے اللہ کا شریک بناتا ہے بلکہ یہ کہو کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے۔''[2]

جملہ عبادتیں جو اللہ نے بتائی ہیں سراسر اسی ذات الٰہی کے لیے ہیں کیونکہ دین صرف اسی کے لیے خالص ہونا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤْتُوا۟ ٱلزَّكَوٰةَ ۚ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلْقَيِّمَةِ ﴿٥﴾﴾

---

[1] سنن أبی داود، الأدب، باب لایقال خبثت نفسی، حدیث :4980 و سنن ابن ماجه، الکفارات، باب النهی أن یقال ماشاء اللّٰه وشئت، حدیث:2118۔ اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مسند أحمد 1/ 347,283,224,214۔ اس کی سند صحیح ہے۔

''انھیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں درحالیکہ اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں، ابراہیم حنیف (علیہ السلام) کے دین پر اور نماز کو قائم رکھیں اور زکاۃ دیتے رہیں۔ یہی دین درست اور مضبوط ہے۔''[1]

پس تمام عبادات، یعنی نماز، خاص اللہ ہی کے لیے ہے۔ صدقہ، خاص اللہ ہی کے لیے ہے۔ روزہ، خاص اللہ ہی کے لیے ہے اور حج خاص اللہ ہی کے لیے ہے۔

اسلام ہی دین الٰہی ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ ٱلْإِسْلَـٰمِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى ٱلْـَٔاخِرَةِ مِنَ ٱلْخَـٰسِرِينَ ﴿٨٥﴾﴾

''جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے تو اس کا دین قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہوگا۔''[2]

یہ حکم تمام اگلے پچھلے انسانوں کے لیے عام ہے۔ کیونکہ اسلام ہی وہ دین ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر اور اس کے تمام مومن بندے استوار چلے آتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام مثلاً حضرت نوح، ابراہیم، یعقوب، موسیٰ، سلیمان وغیرہم علیہم السلام اور مومنین کے بارے میں اپنی کتاب میں وضاحت فرمائی ہے، چنانچہ اولین رسول نوح علیہ السلام کی نسبت فرمایا:

﴿وَٱتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِۦ يَـٰقَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِى وَتَذْكِيرِى بِـَٔايَـٰتِ ٱللَّهِ فَعَلَى ٱللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوٓا۟ أَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ ٱقْضُوٓا۟ إِلَىَّ وَلَا تُنظِرُونِ ﴿٧١﴾ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَمَا

---

[1] البينة 98:5 [2] آل عمران 3:85

سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾

''اور آپ ان کو نوح (علیہ السلام) کا قصہ پڑھ کر سنائیے جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تم کو میرا رہنا اور احکام الٰہی کی نصیحت کرنا بھاری معلوم ہوتا ہے تو میرا تو اللہ ہی پر بھروسا ہے۔ تم اپنی تدبیر اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر پختہ کرلو۔ پھر تمھاری تدبیر تمھاری گھٹن کا باعث نہ ہونی چاہیے۔ پھر میرے ساتھ کر گزرو اور مجھ کو مہلت نہ دو۔ پھر بھی اگر تم اعراض ہی کیے جاؤ تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا۔[1] میرا معاوضہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے، اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں اطاعت کرنے والوں میں سے رہوں۔''[2]

حضرت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی بابت فرمایا:

﴿وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ ۚ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ﴿١٣٠﴾ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ ۖ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٣١﴾ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٣٢﴾﴾

''دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بے وقوف ہو۔ ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ جب کبھی بھی انھیں ان کے رب نے کہا کہ فرمانبردار ہو جا، انھوں نے فوراً کہا کہ میں نے

---

[1] تقریباً تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی قوموں سے یہی کہا کہ ہم تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے یعنی ہم جو کچھ حق سمجھتے ہیں اس کا اعلان کرتے ہیں، اگر تم سے کچھ لینا ہوتا تو تمھاری رعایت سے حق چھپانے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ حق کا اظہار اس وقت مسلمانوں سے مفقود ہو گیا ہے کیونکہ جو لوگ پیشوا بن بیٹھے ہیں ان کا پیٹ ہی عوام الناس کی خیرات سے چل رہا ہے، اس لیے وہ اپنے پیٹ کے ڈر سے حق کا اعلان نہیں کر سکتے۔

[2] یونس 10:71-72

رب العالمین کی فرمانبرداری کی۔ اسی کی وصیت ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو کی، کہ میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے اس دین کو پسند فرمالیا ہے۔ خبردار! تم مسلمان ہی مرنا۔''[1]

حضرت یوسف علیہ السلام کی بابت فرمایا:

﴿رَبِّ قَدْ ءَاتَيْتَنِي مِنَ ٱلْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ ٱلْأَحَادِيثِ ۚ فَاطِرَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّۦ فِي ٱلدُّنْيَا وَٱلْآخِرَةِ ۖ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِٱلصَّٰلِحِينَ﴾

''اے میرے پروردگار! تو نے مجھے ملک عطا فرمایا اور تو نے مجھے خواب کی تعبیر سکھائی، اے آسمان وزمین کے پیدا کرنے والے! تو ہی دنیا وآخرت میں میرا والی اور کارساز ہے، تو مجھے مسلمان مار اور نیکوکاروں سے ملا دے۔''[2]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے بارے میں فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يَٰقَوْمِ إِن كُنتُمْ ءَامَنتُم بِٱللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوٓا۟ إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ ﴿٨٤﴾﴾

''اور موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا کہ اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر توکل کرو، اگر تم اطاعت کرنے والے ہو۔''[3]

بنی اسرائیل کے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا۟ لِلَّذِينَ هَادُوا۟ وَٱلرَّبَّٰنِيُّونَ وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَٰبِ ٱللَّهِ وَكَانُوا۟ عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا۟ ٱلنَّاسَ وَٱخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا۟ بِـَٔايَٰتِى ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾﴾

---

[1] البقرة 2:130-132

[2] یوسف 101:12 [3] یونس 84:10

''ہم نے تورات نازل فرمائی ہے جس میں ہدایت ونور ہے، انبیاء جو اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے، اللہ والے اور علمائے کرام یہودیوں میں اسی تورات کے ساتھ فیصلے کرتے تھے کیونکہ انھیں اللہ کی اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا اور وہ اس پر اقراری اور گواہ تھے۔ لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو اور صرف میرا ڈر رکھو، میری آیتوں کو تھوڑے تھوڑے مول پر نہ بیچو، جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ پورے اور پختہ کافر ہیں۔''[1]

ملکۂ بلقیس کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾

''اے پروردگار! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور میں سلیمان (علیہ السلام) کے ساتھ رب العالمین کی فرماں بردار بن گئی۔''[2]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے بارے میں فرمایا:

﴿وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى الْحَوَارِيِّينَ أَنْ آمِنُوا بِي وَبِرَسُولِي قَالُوا آمَنَّا وَاشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾ ﴾

''اور جب کہ میں نے حواریوں کو حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم پورے فرمانبردار ہیں۔''[3]

اور فرمایا:

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴿١٢٥﴾ ﴾

''باعتبار دین کے اس شخص سے اچھا کون ہے جو اپنا منہ اللہ کے احکام پر دھر دے اور

---

[1] المائدة 5:44 [2] النمل 27:44 [3] المائدة 5:111

ہو بھی نیکوکار، ساتھ ہی یکسوئی والے ابراہیم (علیہ السلام) کے دین کی پیروی کر رہا ہو اور ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دوست بنالیا ہے۔"[1]

اور فرمایا:

﴿وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾﴾

"اور انھوں نے کہا کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا، یہ صرف ان کی آرزوئیں ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل پیش کرو۔ سنو! جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے بشرطیکہ وہ نیکوکار ہو، تو اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔ ان پر کوئی خوف ہوگا نہ غم۔"[2]

اخلاص اور عمل صالح کیا ہے؟

﴿أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ﴾ کی تفسیر یہ بتائی گئی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے قصدِ عبادت کو خالص کرے اور ساتھ ساتھ اس عمل صالح کو اختیار کرے جس کا حکم دیا گیا ہے۔ یہی دونوں چیزیں دین کی حقیقی بنیادیں ہیں۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور وہی عبادت کی جائے جس کا اس نے حکم دیا ہے خود اپنے دل سے عبادتیں ایجاد نہ کی جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَمَن كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾

"جسے بھی اپنے پروردگار سے ملاقات کی آرزو ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھے عمل کرے اور

---

[1] النساء 125:4 [2] البقرة 2:111-112

اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔''[1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے: ''الٰہی! میرے تمام اعمال کو صالح بنادے اور انھیں صرف اپنے لیے خالص کردے اور ان کا کوئی حصہ بھی کسی دوسرے کے لیے نہ ہونے دے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾[2] کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس کے معنیٰ ہیں: ''سب سے زیادہ خالص، اور سب سے زیادہ صحیح عمل'' شاگردوں نے پوچھا: ابو علی! اس سے کیا مراد ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اگر عمل خالص ہے تو صحیح بھی ہو اور اگر صحیح نہیں تو قبول نہ ہوگا، اسی طرح اگر صحیح ہے مگر خالص نہیں تو بھی قبول نہ ہوگا۔ اسے بیک وقت خالص اور صحیح ہونا چاہیے۔ خالص کے معنی ہیں کہ خاص اللہ کے لیے ہو اور صحیح یہ ہے کہ سنت کے مطابق ہو۔

کلمۂ شہادت کی تحقیق

اصل الاصول دو ہیں یعنی کلمۂ شہادت ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ '' یعنی توحید ورسالت کی گواہی۔ کیونکہ جب یہ شہادت دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، تو اس کا لازمی مطلب یہ بھی ہوگا کہ الوہیت صرف اسی کے لیے خاص ہے۔ لہٰذا جائز نہیں کہ دل کسی اور طرف لگاؤ رکھے بلکہ تمام تر محبتیں، الفت، امید وبیم، تعظیم وتکریم اور رغبت ورہبت اسی ذات برتر وحدہ لاشریک لہ کے لیے خالص رکھی جائے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَقَٰتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ ٱلدِّينُ كُلُّهُۥ لِلَّهِ﴾

---

[1] الکھف 110:18 [2] الملک 2:67

''اوران سے لڑائی کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کے لیے ہوجائے۔''[1]

دینِ کامل

لیکن اگر دین کا کوئی حصہ اللہ کے لیے ہو اور کوئی غیر اللہ کے لیے تو یہ شرک ہے۔ کامل دین وہ ہے جو حدیث میں بیان کر دیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا: ''جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے نفرت کی، اللہ کے لیے دیا، اللہ کے لیے روکا، تو اس کا دین کامل ہوگیا۔''[2]

پس مومن صرف اللہ سے محبت کرتا ہے اور اللہ ہی کے نام پر محبت کرتا ہے۔ لیکن مشرک اللہ کے ساتھ ساتھ دوسروں سے بھی محبت کرتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ ٱللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ ٱللَّهِ ۖ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾

''بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اوروں کو اللہ کے شریک ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے ہونی چاہیے اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں۔''[3]

---

① الأنفال 39:8

② سنن أبي داود، السُّنة، باب الدليل على زيادة الإيمان ونقصانه، حديث:4681۔ ترمذی میں بھی اسی مفہوم کی روایت ہے دیکھیے: جامع الترمذی، صفة القيامة، باب حديث اعقِلها وتوكّل، حديث :2521۔ اس کی سند میں ابومرحوم عبدالرحیم بن میمون اور سہل بن معاذ کے متعلق ابن معین اور ابوحاتم رازی نے کلام کیا ہے لیکن جمہور کے ہاں یہ دونوں قابل حجت ہیں، لہٰذا یہ روایت حسن ہے۔

③ البقرة 165:2

اطاعتِ رسول کے معنی

اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی شہادت دینے والا اس بات کا اپنے آپ کو مکلّف بنالیتا ہے کہ جو کچھ بھی آپ نے بتایا ہے، اس کی تصدیق کی جائے۔ ہر حکم میں آپ کی اطاعت کی جائے۔ جو کچھ آپ نے قائم کر دیا ہے، اسے قائم کیا جائے اور جو کچھ آپ نے مسترد کر دیا ہے، اسے مسترد کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء وصفات بیان کر دیے گئے ہیں وہی اس کی طرف منسوب کیے جائیں اور مخلوق کی مماثلت کی جو تردید رسول اللہ ﷺ نے کی ہے، اسے مسترد رکھا جائے اور یقین کیا جائے کہ حلال وہی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے حلال بتایا ہے اور حرام وہی ہے جسے اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے۔

سورۂ انعام واعراف وغیرہ میں مشرکین کی مذمت اسی لیے کی گئی ہے کہ انھوں نے ایسی چیزیں حرام قرار دے لی تھیں، جو اللہ نے حرام نہیں ٹھہرائیں اور ایسا دین بنالیا جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا ۖ فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ ۗ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿١٣٦﴾﴾

”لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا جو اس نے کھیتی اور چوپایوں کی شکل میں پیدا کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے۔ پھر جو چیز ان کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کی

ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ کس قدر برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔“ ①

اسی طرح فرمایا:

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَـٰٓؤُا۟ شَرَعُوا۟ لَهُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنۢ بِهِ ٱللَّهُ﴾

”کیا ان لوگوں نے اللہ کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنھوں نے ایسے احکام دین مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔“ ②

اور اپنے نبی کریم ﷺ سے فرمایا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِىُّ إِنَّآ أَرْسَلْنَـٰكَ شَـٰهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿٤٥﴾ وَدَاعِيًا إِلَى ٱللَّهِ بِإِذْنِهِۦ وَسِرَاجًا مُّنِيرًا ﴿٤٦﴾﴾

”اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا، اللہ کے حکم سے اسی کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔“ ③

بدعتی ضرور مشرک ہوتا ہے

اس مذکورہ بالا آیت میں رسول اللہ ﷺ کو خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے تاکہ آپ اس کی طرف اسی کے حکم کے مطابق دعوت دیں۔ پس جو کوئی غیر اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے، شرک کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اس کی طرف دعوت دیتا ہے تو بدعت کرتا ہے۔ شرک بھی ایک بدعت ہے اور بدعتی آہستہ آہستہ شرک کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ کبھی کوئی بدعتی ایسا نہیں ہوا جس میں شرک کی کوئی نہ کوئی قسم موجود نہ ہو۔ جیسا کہ

---

① الأنعام 136:6 ② الشوریٰ 21:42

③ الأحزاب 45-46:33

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾ ﴾

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح (علیہ السلام) کو بھی، حالانکہ انھیں صرف ایک ہی معبود کی عبادت کا حکم کیا گیا تھا، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔''[1]

احبار و رہبان کو شریک بنانا یہی تھا کہ وہ ان کے لیے حرام کو حلال کر دیتے تھے اور لوگ ان کی اطاعت کرنے لگتے تھے اور وہ حلال کو حرام کر دیتے تھے تو بھی لوگ ان کی پیروی کرنے لگتے تھے۔ اور فرمایا:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿٢٩﴾ ﴾

''اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر، نہ روزِ قیامت پر اور اسے حرام نہیں سمجھتے جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دین حق کو قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''[2]

اس آیت میں اللہ اور آخرت پر ان کے عدم ایمان کو اس بات کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، جبکہ ان کے برخلاف مومن ان تمام باتوں میں رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں جو اللہ اور

① التوبۃ 31:9 ② التوبۃ 29:9

یومِ آخرت کی بابت آپ نے بتائی ہیں، ہر بات میں رسول اللہ کی اطاعت کرتے ہیں، اور اس کے رسول ﷺ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور دین حق کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔

''اسلام'' کی تحقیق

خود لفظ اسلام کے معنی بھی یہی ہیں کہ اپنے آپ کو سپرد کر دینا، حوالے کر دینا، فرماں بردار ہو جانا اور اخلاص کا مفہوم بھی اس کے ضمن میں شامل ہے۔

پس اسلام کا دعویٰ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ صرف اللہ واحد کے لیے خود کو سپرد کیا جائے اور اس کے سوا کسی کے لیے بالکل سپردگی نہ ہو۔ یہی کلمہ لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی حقیقت ہے لیکن جو خود کو اللہ کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی سپردگی میں بھی دے دیتا ہے، وہ مشرک ہے اور یہ معلوم ہے کہ اللہ شرک کو معاف نہیں کرے گا۔ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ کے سپرد نہیں کرتا بلکہ اس کی عبادت سے تکبر کرتا ہے تو اس کے بارے میں فرمایا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴿٦٠﴾﴾

''تمھارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمھاری دعاؤں کو سنوں گا۔ یقین مانو کہ جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب منہ کے بل دوزخ میں داخل ہوں گے۔''[1]

اور صحیح مسلم میں ہے کہ تکبر کے متعلق نبیٔ معظم ﷺ نے فرمایا: ''جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا اور جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہے، وہ

[1] المؤمن 60:40

دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔'' عرض کیا گیا، اللہ کے رسول! کوئی آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو، اس کا جوتا اچھا ہو، کیا یہ بھی تکبر ہے؟ فرمایا: ''نہیں، اللہ جمیل اور خوبصورت ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق سے انکار کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔''[1]

یہودیوں کا وصف، تکبر ہے اور عیسائیوں کا شرک۔ یہودیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿أَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌۢ بِمَا لَا تَهْوَىٰٓ أَنفُسُكُمُ ٱسْتَكْبَرْتُمْ﴾

''کیا جب کوئی رسول تمھاری خواہش کے خلاف کوئی حکم لاتا (تو) تم تکبر (سے نافرمانی) کرتے۔''[2]

اور عیسائیوں کے بارے میں فرمایا:

﴿ٱتَّخَذُوٓا۟ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَـٰنَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ وَٱلْمَسِيحَ ٱبْنَ مَرْيَمَ وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوٓا۟ إِلَـٰهًا وَٰحِدًا ۖ لَّآ إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَـٰنَهُۥ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾﴾

''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اور مسیح ابن مریم (علیہما السلام) کو رب بنا لیا ہے، حالانکہ ان کو صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ واحد ہی کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔''[3]

اور انھی کے سلسلے میں فرمایا:

﴿قُلْ يَـٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَـٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن

---

[1] صحيح مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر وبيانه، حديث: 91

[2] البقرة 87:2 [3] التوبة 31:9

تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾ ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔''[1]

اور اہل کتاب کو مخاطب کر کے اسلام کی تقریر اس طرح فرمائی:

﴿قُولُوٓا ءَامَنَّا بِٱللَّهِ وَمَآ أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَآ أُنزِلَ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَـٰعِيلَ وَإِسْحَـٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِىَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَآ أُوتِىَ ٱلنَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ ءَامَنُوا۟ بِمِثْلِ مَآ ءَامَنتُم بِهِۦ فَقَدِ ٱهْتَدَوا۟ ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا۟ فَإِنَّمَا هُمْ فِى شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ ٱللَّهُ ۚ وَهُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ ٱللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ ٱللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُۥ عَـٰبِدُونَ ﴿١٣٨﴾ قُلْ أَتُحَآجُّونَنَا فِى ٱللَّهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ أَعْمَـٰلُنَا وَلَكُمْ أَعْمَـٰلُكُمْ وَنَحْنُ لَهُۥ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ ﴾

''کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو اتارا گیا ہماری طرف اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اور اسباط (اولاد یعقوب) کی طرف اتارا گیا اور جو موسیٰ و عیسیٰ کو دیا گیا اور جو نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے اور ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ اگر وہ بھی اسی طریق سے ایمان لے آئیں جس طریق سے تم ایمان لائے ہو تب وہ بھی ہدایت پر ہو جائیں گے اور اگر وہ روگردانی کریں تو وہ لوگ مخالفت میں ہیں۔ عنقریب اللہ تمھارے لیے

---

[1] آل عمران 3:64

کافی ہوگا اور وہ سمیع و علیم ہے۔ کہو کہ ہم اللہ کے رنگ پر ہیں اور اللہ کے رنگ سے اچھا کس کا رنگ ہے اور ہم اس کے عبادت گزار ہیں۔ کہو تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کرتے ہو حالانکہ وہ ہمارا اور تمھارا سب کا پروردگار ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمھارے اعمال تمھارے لیے اور ہم تو صرف اللہ ہی کے ہو چکے ہیں۔''[1]

[1] البقرة 2:136-139

فصل 25

دین الٰہی کی بنیاد

دین الٰہی یعنی اسلام کی اصل و بنیاد ایک ہے اگرچہ شریعتیں جدا جدا ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم تمام انبیاء کا دین ایک ہے اور انبیاء علّاتی بھائی ہیں، ابن مریم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق دار میں ہوں کیونکہ میرے اوران کے مابین کوئی نبی نہیں۔''[1] پس تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی جائے۔ ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی اسی طریقے پر عبادت کرنا، جس کا اس نے حکم دیا، اس زمانے کا طریقۂ اسلام تھا۔

شریعت میں ناسخ ومنسوخ کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسا ایک ہی شریعت میں کبھی کوئی حکم بدل جاتا ہے۔ مثلاً دین اسلام جسے محمد ﷺ لے کر تشریف لائے، ایک ہی دین ہے۔ لیکن ایک زمانے میں نماز کے لیے بیت المقدس کو قبلہ بنانا واجب تھا، پھر کعبہ کو قبلہ بنادیا گیا اور بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنا حرام ہوگیا۔ تبدیلی تو ضرور واقع ہوئی مگر دین ایک ہی رہا۔ اسی طرح اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سبت (ہفتہ) مقرر کیا تھا پھر اسے منسوخ کرکے ہماری امت کے لیے جمعہ مقرر کردیا۔ لہٰذا اس زمانے میں اجتماع، سبت (ہفتہ) کا تھا، پھر جمعہ کا اجتماع واجب اور سبت کے دن کا حرام ہوگیا۔ لہٰذا اس تبدیلی سے پہلے جوکوئی موسوی

---

[1] صحیح البخاری، أحادیث الأنبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ ﴿واذکر فی الکتاب مریم ....﴾ حدیث: 3442

شریعت سے نکل گیا وہ بھی مسلم نہ رہا اور تبدیلی کے بعد جو کوئی شریعت محمدی میں داخل نہ ہوا، وہ بھی مسلم نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو ہرگز یہ حکم نہیں دیا کہ غیر اللہ کی عبادت کی جائے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُم مِّنَ ٱلدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِۦ نُوحًا وَٱلَّذِىٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِۦٓ إِبْرَٰهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰٓ ۖ أَنْ أَقِيمُوا۟ ٱلدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا۟ فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى ٱلْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ﴾

''اس نے تمھارے لیے وہی شریعت مقرر کر دی ہے جس کے قائم کرنے کا نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا اور جو بذریعہ وحی ہم نے تیری طرف بھیج دی ہے اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ جس چیز کی طرف آپ ان مشرکوں کو بلا رہے ہیں وہ تو ان پر گراں گزرتی ہے۔''[1]

پس تمام رسولوں کو یہی حکم دیا ہے کہ دین قائم کریں اور اس میں پھوٹ نہ ڈالیں۔ فرمایا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلرُّسُلُ كُلُوا۟ مِنَ ٱلطَّيِّبَٰتِ وَٱعْمَلُوا۟ صَٰلِحًا ۖ إِنِّى بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٥١﴾ وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ ﴿٥٢﴾﴾

''رسولوں کی جماعت! پاک چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو تم جو کچھ کر رہے ہو، اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ یقیناً تمھارا یہ دین ایک ہی دین ہے اور میں ہی تم سب کا رب ہوں، پس تم مجھ سے ڈرتے رہو۔''[2]

اور فرمایا:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ ٱللَّهِ ٱلَّتِى فَطَرَ ٱلنَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ

---

[1] الشوریٰ 42:13 [2] المؤمنون 23:51-52

لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾

''پس آپ یک سو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت (لازم پکڑو) جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بدلنا نہیں۔ یہی راست دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔''[1]

پھر فرمایا:

﴿مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾﴾

''اسی (اللہ تعالیٰ) کی طرف رجوع کر کے اس سے ڈرتے رہو اور نماز قائم رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی گروہ گروہ ہو گئے ہر گروہ اسی چیز پر جو اس کے پاس ہے، نازاں ہے۔''[2]

مشرکوں میں پھوٹ

پس اہل شرک متفرق ہیں اور اہل اخلاص متفق ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ﴿١١٨﴾ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ﴾

''وہ ہمیشہ اختلاف ہی میں رہتے ہیں۔ بجز ان کے جن پر تیرے رب نے رحم کیا اور اللہ نے اسی لیے انھیں پیدا کیا ہے۔''[3]

پس اہل رحم مجتمع و متفق ہیں اور مشرکین اپنے دین میں پھوٹ ڈال چکے ہیں اور فرقے بنا چکے ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ جہاں بھی شرک و بدعت کا وجود ہوگا، اختلاف و تفریق ضرور پیدا

---

① الروم 30:30 ② الروم 31:30-32

③ هود 11:118-119

ہو جائے گی۔ چنانچہ عرب کی ہر مشرک قوم کا الگ الگ دیوتا تھا۔ ایک قوم دوسری قوم کے دیوتا سے بیزار تھی۔ بلکہ بعض کی شریعتیں بھی جدا جدا تھیں۔ جیسا کہ مدینہ والے منات کی تکبیر بلند کرتے اور صفا ومروہ کے مابین طواف ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم نے اس کا حکم دیا۔

اسی طرح جن لوگوں میں کچھ شرک پیدا ہو جاتا ہے، ان میں اتفاق باقی نہیں رہتا۔[1] چنانچہ قبور اور انبیاء وصالحین کے آثار کو مسجدیں قرار دینے والوں کا بھی یہی حال ہے، ان کا ہر گروہ دعا واستغاثہ اور توجہ کے لیے ایسی جگہ جاتا ہے جو دوسرے گروہ کے ہاں واجب التعظیم نہیں۔

موحدوں کے اعمال

برخلاف ان کے موحد صرف اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے اور اگر ان میں کبھی اجتہادی مسائل میں کوئی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو اس سے تفریق ومخالفت پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایسے مسائل میں صحیح رائے قائم کرنے والے کے لیے دو ثواب ہیں اور غلطی کرنے والے کے لیے بھی اس کے اجتہاد کی وجہ سے ایک ثواب ہے[2] اور اس کی غلطی معاف ہے۔ اللہ ہی ان کا معبود ہے، وہ اسی کی پرستش کرتے

---

[1] مسلمانوں کی موجودہ نااتفاقی کا رونا سب روتے ہیں مگر کوئی اس کے اصلی سبب پر غور نہیں کرتا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہاں وہ سبب بیان کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا اتفاق اللہ ہی کے نام پر ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نام سے مقصود یہ ہے کہ سب لوگ شرک وبدعت سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوط پکڑ لیں اور وہ رسی، کتاب وسنت ہے مگر ہمارے موجودہ پیشواؤں کی سنہری، روپہلی مصلحتیں کیا ایسا ہونے دیں گی؟

[2] صحيح البخاري، الاعتصام، باب أجر الحاكم إذا اجتهد فأصاب أو أخطأ، حديث: 7353 وصحيح مسلم، الأقضية، باب بيان أجر الحاكم إذا اجتهد ...... ،حديث: 1716

ہیں، اسی پر توکل کرتے ہیں، اسی سے ڈرتے ہیں، اسی سے امید رکھتے ہیں، اسی سے استعانت واستغاثہ کرتے ہیں، اسی سے دعائیں کرتے ہیں، اسی سے مرادیں مانگتے ہیں اور جب نماز کے لیے مسجدوں کا قصد کرتے ہیں تو اسی کے فضل ورضوان کے طالب ہوتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿تَرَىٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ ٱللَّهِ وَرِضْوَٰنًا﴾

''تو انھیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجود کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل ورضا مندی کی جستجو میں ہیں۔''[1]

اسی طرح وہ تینوں افضل مساجد کا سفر کرتے ہیں خصوصاً مسجد حرام کا، جس کے حج کا حکم دیا گیا ہے، تو وہ اللہ ہی کا فضل ورضوان چاہتے ہیں، کسی دوسرے کی طرف رغبت نہیں رکھتے، کسی سے آرزو نہیں رکھتے اور کسی سے خوف نہیں کھاتے۔

لیکن شیطان نے بہت سے لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے اور اخلاص الٰہی سے ہٹا کر شرک کی کسی نہ کسی قسم میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ لوگ سفر یا زیارت سے غیر اللہ کی خوشی چاہتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف رغبت رکھتے ہیں، کسی نبی یا ولی کی اصلی یا فرضی قبر کے لیے شد رحال اور سفر کرتے ہیں تاکہ اس سے دعا کریں، اس کی طرف اپنی دلی توجہ کریں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی حج سے غرض اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ کسی مخلوق کی قبر پر حاضری دیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو اس طرح کی زیارت کو خود حج سے بھی زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔

شیوخ کی ضلالت

ان کے بعض شیوخ کا تو یہ حال ہے کہ سفر حج کے لیے شروع کرتے ہیں مگر مدینہ پہنچ کر

---

[1] الفتح 29:48

لوٹ آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ حج سے بہتر ہے۔ بعض اَن پڑھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ زیارت قبور واجب ہے۔ وہ قبر میں مدفون ہڈیوں سے اسی طرح التجائیں کرتے ہیں جس طرح ایسے زندہ سے کی جاتی ہے، جسے کبھی موت نہیں، یعنی اللہ تعالی سے۔ کبھی یہ لوگ قبروں پر اپنی اولاد کو چڑھادیتے ہیں۔ ان کے نام پر جانور چھوڑتے ہیں جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر کیا کرتے تھے۔

قبروں کے بہت سے مجاور، جاہلوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ ہم تمھاری التجا صاحب قبر کے سامنے پیش کردیں گے، وہ نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کرے گا اور نبی کریم ﷺ اللہ کے سامنے۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو قبروں پر پردہ لٹکاتے اور چادر چڑھاتے ہیں، حالانکہ یہ وہ باتیں ہیں جن کی حرمت پر تمام مسلمان متفق ہیں نتیجہ یہ نکلا کہ مسجدیں ویران ہیں لیکن قبریں آباد ہیں۔ [1]

بہت سے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ان قبروں کے پاس جن کی وہ تعظیم کرتے ہیں، نماز پڑھنا اللہ کے گھر یعنی مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ چنانچہ ان مشرکانہ مقامات میں نماز و دعا کے لیے ہجوم کرتے ہیں، حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے قبروں کو مسجدیں قرار دینے سے منع کیا ہے۔ وہ مسجدوں میں نماز ترک کردیتے ہیں، حالانکہ وہ اللہ کے گھر ہیں جن کو بلند کرنے اور وہاں اللہ کا نام ذکر کرنے کا خود اس نے حکم دیا ہے۔

ان کے بعض اکابر کا قول ہے کہ نماز میں کعبہ کو قبلہ بنانا عوام کے لیے ہے، لیکن فلاں شیخ کی قبر کو قبلہ بنانا اور کعبہ کو پس پشت رکھنا خواص کے لیے ہے، حالانکہ یہ اور اس طرح کی

---

[1] وہ قوم کیوں نہ تباہ و برباد ہوگی جو زندوں کی قدر نہیں کرتی مگر مردوں کو خدا بنائے ہوئے ہے۔ ہندوؤں پر اعتراض ہے کہ بت پرست ہیں لیکن بت پرستی، قبر پرستی سے اگر بہتر نہیں تو بدتر بھی نہیں ہے۔ وہ قوم کیونکر زندہ رہ سکتی ہے جس نے مردوں کو معبود بنا رکھا ہو۔

باتیں باتفاق جملہ علمائے دین صریح کفر ہیں۔

یہ مسائل مزید شرح وبسط کے متقاضی ہیں مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ہم نے صرف اصول کی طرف اشارے کر دیے ہیں اور تفصیل دوسری کتابوں میں بیان کی ہے۔ یہاں ہم نے مقاصدِ شریعت، اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاصِ دین اور صرف اسی وحدہ لاشریک کے لیے عبادت اور شرک و بدعت کی تمام راہوں کے انسداد کی طرف اشاروں پر اکتفا کیا ہے، کہ یہی اصل اسلام ہے، تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے دین کی یہی حقیقت ہے اور توحید رب العالمین بھی یہی ہے۔

فہم توحید میں غلطی

اہل کلام اور اہل بدعت کے بہت سے فرقوں نے خود توحید کے معنی متعین کرنے میں سخت غلطی کی ہے حتیٰ کہ اس کی حقیقت ہی الٹ دی ہے۔ چنانچہ بعض نام نہاد صوفیوں نے کہا ہے کہ توحید ربوبیت غایت اصلی ہے اور اس میں فنا ہو جانا اس کی انتہا ہے اور یہ کہ جب آدمی نے توحید ربوبیت کا مشاہدہ کر لیا تو اس سے نیکی، بدی سب کا بوجھ اتر گیا۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ امر و نہی اور وعد و وعید سب ان کی نظر میں معطل ہو گئے۔

انھیں یہ ٹھوکر اس لیے لگی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں (جو تمام مخلوقات کو شامل ہے) اور اس کی محبت و رضامندی میں (جو طاعات کے ساتھ خاص ہے) فرق نہ کر سکے۔ یا یوں کہیں کہ اس کے کلمات تکوینیہ میں (جو نیک و بد سب پر نافذ ہیں) اور اس کے کلمات دینیہ[1] (جن کی موافقت، انبیاء و اولیاء کے ساتھ خاص ہے) میں فرق نہ کر سکے، حالانکہ بندے پر واجب ہے کہ ربوبیت الٰہی کی شہادت کے ساتھ ساتھ، جو مومن و کافر اور نیک و بد سب کو عام ہے، اس

[1] کلمات تکوینیہ سے مقصود مشیت الٰہی ہے اور کلمات دینیہ سے مقصود شریعت الٰہی ہے۔

کی الوہیت کی شہادت بھی دے لیکن یہ شرف اس کے مومن بندوں ہی کو حاصل ہے جنھوں نے اس کی عبادت کی ہے، اس کے حکم کی اطاعت کی ہے اور اس کے رسولوں کی پیروی کی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَمْ نَجْعَلُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ كَٱلْمُفْسِدِينَ فِى ٱلْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ ٱلْمُتَّقِينَ كَٱلْفُجَّارِ ﴿٢٨﴾﴾

''کیا ہم ان لوگوں کو، جو ایمان لائے اور عمل صالح کرتے رہے، ان کے برابر کریں گے جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں؟ کیا پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کردیں گے؟''[1]

اور فرمایا:

﴿أَمْ حَسِبَ ٱلَّذِينَ ٱجْتَرَحُوا۟ ٱلسَّيِّـَٔاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَمِلُوا۟ ٱلصَّٰلِحَٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۚ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ ﴿٢١﴾﴾

''کیا بدکاروں نے خیال کر رکھا ہے کہ ہم ان کا اور نیکوکار مومنوں کا مرنا جینا یکساں کردیں گے؟ ان کا خیال کس قدر برا ہے۔''[2]

اور فرمایا:

﴿أَفَنَجْعَلُ ٱلْمُسْلِمِينَ كَٱلْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾ أَمْ لَكُمْ كِتَٰبٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٧﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٨﴾ أَمْ لَكُمْ أَيْمَٰنٌ عَلَيْنَا بَٰلِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَأْتُوا۟ بِشُرَكَآئِهِمْ إِن كَانُوا۟ صَٰدِقِينَ ﴿٤١﴾﴾

''کیا ہم فرماں برداروں کو گناہ گاروں کے برابر کردیں گے، تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسے

---

[1] ص 28:38 [2] الجاثیۃ 21:45

فیصلے کرتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں پڑھ لیتے ہو کہ سب کچھ تمھاری پسند کے مطابق ہوگا؟ کیا تم نے ہم سے قیامت کے دن تک قسمیں لے لی ہیں کہ تمھیں وہی ملے گا جو تم پسند کرو گے؟ ان سے پوچھیے کہ اس بات کا ضامن کون ہے؟ یا ان کے لیے شرکاء ہیں؟ اگر یہ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو لے آئیں۔''[1]

جو کوئی اللہ کے دوستوں اور اللہ کے دشمنوں میں اس کے حکم کردہ (ایمان وعمل صالح) اور اس کے ناپسند کردہ (کفر وفسق اور عصیان) میں فرق نہیں کرتا تو وہ ضرور مشرکین کے دین میں گر پڑے گا، اگرچہ اللہ کی قدرت ومشیّت اور خلاّقیت ہر چیز کو شامل ہے۔

تقدیر پر ایمان

تقدیر پر ایمان رکھنا چاہیے مگر اس سے احتجاج کرنا روا نہیں۔ بندے پر فرض ہے کہ مصائب کے وقت تقدیر کی طرف رجوع کرے، صبر کرے اور عیوب وذنوب پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ﴾

''صبر کر بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنی خطا پر مغفرت طلب کر۔''[2]

اسی بنا پر حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قائل کر لیا تھا جب کہ انھوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو ملامت کی کہ ممنوعہ شجر کا پھل کھا کر آپ نے تمام انسانوں کو مصیبت میں کیوں مبتلا کیا؟ تو حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ مصیبت میری پیدائش سے پہلے لکھی جا چکی تھی۔[3]

---

[1] القلم 68:35-41 [2] المؤمن 40:55

[3] صحیح البخاری، أحادیث الأنبیاء، باب وفاۃ موسیٰ، حدیث:3409 وصحیح مسلم، القدر، باب حجاج آدم وموسیٰ علیہما السلام، حدیث:2652

جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فِىٓ أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِى كِتَـٰبٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَآ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٢٢﴾﴾

''نہ کوئی مصیبت زمین پر آتی ہے نہ خود تم پر لیکن وہ پہلے ہی سے کتاب میں لکھی ہوتی ہے۔ یہ اللہ کے لیے آسان کام ہے۔''[1]

اور فرمایا:

﴿مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ وَمَن يُؤْمِنۢ بِٱللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُۥ ۚ﴾

''کوئی مصیبت بھی بغیر حکم الٰہی کے نہیں آ سکتی جو کوئی اللہ پر ایمان لاتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت بخش دیتا ہے۔''[2]

بعض علمائے سلف رحمہم اللہ نے اس آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جسے جب کوئی مصیبت لاحق ہوتی ہے تو اسے اللہ کی طرف سے سمجھ کر راضی ہو جاتا ہے، اور اپنے آپ کو اس کی مشیت کے حوالے کر دیتا ہے۔ تقدیر سے حضرت آدم علیہ السلام کے حجت پکڑنے کی بھی یہی توجیہ ہے، ورنہ ظاہر ہے آدم علیہ السلام بلکہ ان سے کم تر مومنین بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ معاصی اور گناہ تقدیر کا نتیجہ ہیں۔ اگر یہ استدلال صحیح ہو تو پھر ابلیس اور اس کے تمام پیرو بھی یہی دلیل پکڑ سکتے ہیں۔ قوم نوح، عاد و ثمود غرض تمام سرکش اور مجرم یہی عذر پیش کر سکتے ہیں اور اگر یہ عذر معقول و مقبول ہو جائے تو پھر کسی کو کسی خطا پر سزا نہیں دی جا سکتی۔

غور کیجیے تقدیر سے اس طرح حجت پکڑنے والوں پر اگر ظلم یا زیادتی کی جائے تو اس وقت اسے تقدیر کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ جب یہ معاملہ ہوگا تو فوراً واویلا شروع کر دیں گے اور انصاف کے طالب ہوں گے۔ اگر تقدیر سے اس طرح کا استدلال تسلیم کر لیا جائے تو آدمیوں

[1] الحدید 22:57 [2] التغابن 11:64

کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ ہر شخص کو پوری آزادی ہوگی کہ جسے چاہے قتل کر ڈالے اور جس کے مال و آبرو پر چاہے، دست درازی کرنے لگے اور کہہ دے کہ یہ تقدیر کا نتیجہ ہے۔

توحید میں تحریف

بدعتیوں کے ایک گروہ نے توحید میں صفات الٰہی کی نفی داخل کر دی ہے اور اس سے احکام الٰہی کی اطاعت خارج کر دی ہے اگر ان کے اقوال کا نتیجہ نکالا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ خالق ومخلوق کے مابین کوئی فرق نہیں رکھتے یہ لوگ وحدت الوجود کے قائل ہیں جس طرح کہ ملحدین میں سے ایک گروہ کا یہی وحدت الوجود اور حلول کا عقیدہ ہے۔ اور پھر حماقت یہ کہ اس کے ساتھ ساتھ توحید اور تحقیق ومعرفت کے بھی مدعی ہیں۔ دراصل یہ لوگ شرک وتلبیس اور افترا پردازی میں سب سے سبقت لے گئے ہیں۔

یہ لوگ اپنی گمراہی یہ کہہ کر پھیلاتے ہیں کہ معرفت کے راستے پر چلنے والا، یعنی راہ سلوک اختیار کرنے والا شروع شروع میں اطاعت ومعصیت میں تفریق کرتا ہے، یعنی احکام باری تعالیٰ کو مانتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے۔ پھر وہ ترقی کر کے اس مقام میں پہنچ جاتا ہے جہاں معصیت باقی نہیں رہتی، اطاعت ہی اطاعت رہ جاتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی تقدیر کے بموجب کرتا ہے۔ پھر آگے چل کر اس کی آنکھوں سے حجاب اٹھ جاتا ہے اور وہ صاف دیکھ لیتا ہے کہ کوئی نیک ہے نہ بد، طاعت ہے نہ معصیت، کوئی خالق ہے نہ مخلوق، تمام کائنات ایک ہی وجود ہے۔ ہر چیز اللہ ہے اور اللہ ہر چیز میں ہے۔

گمراہی کا یہ سخت مقام ہے۔ بہت سے لوگوں کا پاؤں یہیں پہنچ کر پھسل گیا ہے، حالانکہ اگر اللہ کی ہدایت شامل ہو تو گمراہی سے بچنا بالکل آسان ہے۔

جو شخص احکام الٰہی میں فرق کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات پر ایمان رکھتا ہے، جن کی

رو سے وہ تمام مخلوقات کی مشابہت ومماثلت سے الگ ہوگیا ہے تو وہی شخص ہدایت پر ہے اور وہ اس توحید کو پا گیا ہے جسے لے کر انبیاء علیہم السلام آئے اور کتابیں نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ اخلاص اور سورۂ کافرون میں واضح فرمادیا ہے۔

قرآن کی تقسیم

مطالب کے لحاظ سے قرآن تین حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصہ توحید پر مشتمل ہے، ایک تہائی حصے میں گزشتہ واقعات اور قصص ہیں اور ایک تہائی حصے میں امر و نہی ہے۔ سورۂ اخلاص ایک تہائی قرآن، یعنی توحید کا خلاصہ ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔''[1] کیونکہ اس سورت میں ذات الٰہی اور اس کے اسماء وصفات کا اثبات ہے، یعنی توحید قولی کی جامع ہے۔ فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ ٱللَّهُ أَحَدٌ ۝١ ٱللَّهُ ٱلصَّمَدُ ۝٢ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝٣ وَلَمْ يَكُن لَّهُۥ كُفُوًا أَحَدٌۢ ۝٤﴾

''اے پیغمبر! کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کے کوئی برابر ہے۔''[2]

سورۂ کافرون میں توحید قصدی عملی ہے، اس میں مخلص مومنوں کو، جو اللہ واحد ہی کی عبادت کرتے ہیں، مشرکوں سے جدا کر دیا گیا ہے جو اللہ کے ساتھ غیر اللہ کی بھی عبادت

---

[1] صحیح مسلم، فضائل القرآن و مایتعلق به، باب فضل قراءة ﴿قل هو الله أحد﴾ حدیث: 811۔ یہ حدیث دوسرے الفاظ بھی سے بخاری و مسلم میں ہے دیکھیے: صحیح البخاری، فضائل القرآن، باب فضل ﴿قل هو الله أحد﴾ حدیث: 5013 و صحیح مسلم، صلاة المسافرین، باب فضل قراءة ﴿قل هو الله أحد﴾ حدیث: 812

[2] الإخلاص 112:4-1

کرتے ہیں اگرچہ وہ مشرک بھی اسی رب العالمین کی ربوبیت کے قائل ہیں لیکن چونکہ صرف توحید ربوبیت کافی نہیں بلکہ توحید الوہیت بھی ضروری ہے، اسی لیے وہ مشرک و گمراہ قرار پائے اور دونوں قسم کی توحید کا اقرار کرنے والے مومن قرار پائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْكَٰفِرُونَ ﴿١﴾ لَآ أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ﴿٢﴾ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴿٣﴾ وَلَآ أَنَا۠ عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ﴿٤﴾ وَلَآ أَنتُمْ عَٰبِدُونَ مَآ أَعْبُدُ ﴿٥﴾ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِىَ دِينِ ﴿٦﴾﴾

''کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میں تمھارے معبودوں کی پرستش نہیں کرتا اور تم میرے معبود کی پرستش نہیں کرتے اور نہ میں آئندہ تمھارے معبودوں کی پرستش کروں گا اور نہ تم میرے معبود کی پرستش کرو گے، تمھارے لیے تمھارا طریقہ ہے اور میرے لیے میرا طریقہ۔''[1]

انبیاء علیہم السلام کی ہدایت اور فلسفیوں کی گمراہی

انبیائے کرام علیہم السلام اثبات مفصل اور نفی مجمل کے ساتھ آئے ہیں۔ یعنی وہ تفصیل کے ساتھ اسماء وصفات الٰہی بتاتے ہیں اور مشابہت ومماثلت کی اس سے مجمل نفی کرتے ہیں۔ ان کے بالکل برعکس فلاسفہ اثبات مجمل و نفی مفصل پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں وہ وجود اقدس ایسا نہیں، ویسا نہیں مگر جب اثبات کا معاملہ پیش آتا ہے تو بے سروپا گفتگو کرنے لگتے ہیں، جس میں تناقض کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

﴿سُبْحَٰنَ رَبِّكَ رَبِّ ٱلْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلَٰمٌ عَلَى ٱلْمُرْسَلِينَ ﴿١٨١﴾ وَٱلْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿١٨٢﴾﴾

[1] الکافرون 109:1-6

”پاک ہے آپ کا رب جو بہت عظیم عزت والا ہے، ہر اس چیز سے جو مشرک بیان کرتے ہیں۔ پیغمبروں پر سلام ہے اور ہر طرح کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا رب ہے۔“[1]

لیکن انبیاء علیہم السلام اور قرآن مجید کا طریقہ بالکل صاف ہے۔ قرآن مجید، مقام اثبات میں کہتا ہے کہ اللہ حیّ ہے، قیّوم ہے، علیم و حکیم ، غفور و رحیم، سمیع و بصیر اور علِیّ و عظیم ہے، تمام کائنات کا خالق وہی ہے، عرش عظیم کا مالک وہی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس نے کلام کیا، پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی، مومنوں سے راضی ہوتا ہے، کافروں پر غصہ کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

مقام نفی میں کہتا ہے کہ اس کی مثل کوئی نہیں۔ اس کے ہم پلہ کوئی نہیں، نہ اس کی ذات مقدس میں اور نہ اس کے اسماء وصفات میں۔

﴿سُبْحَٰنَهُۥ وَتَعَٰلَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ﴿٤٣﴾ تُسَبِّحُ لَهُ ٱلسَّمَٰوَٰتُ ٱلسَّبْعُ وَٱلْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَىْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِۦ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ إِنَّهُۥ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿٤٤﴾﴾

”پاک ہے وہ اور بہت برتر ہے ان کی باتوں سے۔ تسبیح کرتے ہیں اس کی ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، کوئی چیز نہیں جو اس کی تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان سب کی تسبیح نہیں سمجھتے، بے شک وہ حلیم و غفور ہے۔“[2]

پس مومن اللہ پر اور اس کے اسمائے حسنیٰ پر ایمان رکھتا ہے۔ انھی کے ذریعے سے دعا کرتا ہے اور اس کے اسماء وصفات میں الحاد نہیں کرتا۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلِلَّهِ ٱلْأَسْمَآءُ ٱلْحُسْنَىٰ فَٱدْعُوهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا۟ ٱلَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِىٓ أَسْمَٰٓئِهِۦ ۚ

---

[1] الصافات 37:180-182 [2] الإسراء 17:43-44

﴿سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٨٠﴾﴾

”اللہ کے سب نام اچھے ہیں، اسے انھی ناموں سے پکارو اوران لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں ان کو جلد ہی ان کے کیے کا بدلہ دے دیا جائے گا۔“[1]

مومن صرف ایک اللہ سے دعا کرتا ہے، اسی کی عبادت کرتا ہے، اس کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا اور مشرکوں کے طریقے سے بچتا ہے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِن شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُم مِّن ظَهِيرٍ ﴿٢٢﴾ وَلَا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ حَتَّىٰ إِذَا فُزِّعَ عَن قُلُوبِهِمْ قَالُوا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ ﴿٢٣﴾﴾

”(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے۔ انھیں پکارو جنھیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا تھا، وہ آسمانوں میں اور زمینوں میں ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار رہی ہے۔ اور اس کے ہاں صرف اس شخص کی سفارش نفع دے گی جسے اللہ اجازت دے گا، حتی کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور کر دی جاتی ہے تو (باہم) کہتے ہیں: تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں: حق (سچ کہا) اور وہ بہت بلند، بہت بڑا ہے۔“[2]

مومن کو کیا کرنا چاہیے؟

یہ مختصر اشارات ہیں جن کی تفصیل وتشریح بہت اہم ہے مگر یہاں اس کی گنجائش نہیں، لہٰذا

---

① الأعراف 180:7 ② سبأ 34:22-23

تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ علم و ایمان کی تحقیق میں پوری کوشش کریں اور اللہ کو اپنا ہادی و ناصر اور حاکم و ولی بنائیں۔ جیسے کہ اللہ نے فرمایا:

﴿فَنِعْمَ ٱلْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ ٱلنَّصِيرُ ﴿٧٨﴾﴾

''اللہ بہت اچھا ولی اور مددگار ہے۔''[1]

نیز فرمایا:

﴿وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ﴿٣١﴾﴾

''اور تیرا رب ہادی و ناصر ہونے کے لحاظ سے کافی ہے۔''[2]

اور اگر چاہیں تو رسول اللہ ﷺ کے الفاظ میں دعا مانگا کریں جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے امام مسلم رحمہ اللہ نے روایت کیے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب رات کو نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو یہ دعا کرتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَإِسْرَافِيلَ ، فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ اهْدِنِي لِمَا اخْتُلِفَ فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ»

''اے اللہ، اے جبریل و میکائیل اور اسرافیل (علیہم السلام) کے پروردگار، اے آسمان و زمین کے خالق، اے غائب و حاضر کا علم رکھنے والے! تو ہی اپنے بندوں کے اختلاف کا فیصلہ کرے گا، لہٰذا حق پہچاننے میں میری رہنمائی کر۔ وہ حق کہ جس میں اختلاف پڑ گیا ہے۔ تو ہی صراط مستقیم کی طرف، جسے چاہتا ہے، ہدایت کرتا ہے۔''[3]

---

[1] الحج 78:22 [2] الفرقان 31:25

[3] صحیح مسلم، صلاۃ المسافرین، باب صلاۃ النبی ﷺ ودعائه باللیل، حدیث:770

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿كَانَ ٱلنَّاسُ أُمَّةً وَٰحِدَةً فَبَعَثَ ٱللَّهُ ٱلنَّبِيِّـۧنَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ ٱلْكِتَـٰبَ بِٱلْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ فِيمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ ۚ وَمَا ٱخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا ٱلَّذِينَ أُوتُوهُ مِنۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ ٱلْبَيِّنَـٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى ٱللَّهُ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لِمَا ٱخْتَلَفُوا۟ فِيهِ مِنَ ٱلْحَقِّ بِإِذْنِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ يَهْدِى مَن يَشَآءُ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾﴾

''دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے، اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوشخبریاں دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگوں کے اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے اور انھی لوگوں نے، جن کو حق دیا گیا تھا، اپنے پاس دلائل آچکنے کے بعد آپس کے بغض و عناد کی وجہ سے اس میں اختلاف کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی اس اختلاف میں بھی حق کی طرف اپنی مشیّت سے رہبری کی اور اللہ، جس کو چاہے اس کی سیدھی راہ کی طرف رہبری کرتا ہے۔''[1]

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ كُلَّ وَقْتٍ وَّحِينٍ (آمِينَ)

[1] البقرة 2:213

تلاش حق سیریز

تلاشِ حق میں سرگرداں لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کے لیے
انتہائی مستند، جامع اور دل پذیر کتابوں کا سیٹ، اردو میں پہلی بار

خود پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھائیے!

* توحید اور ہم
* رحمتِ عالم ﷺ
* قرآن کی عظمتیں اور اس کے معجزے
* اسلام کی امتیازی خوبیاں
* اسلام کے بنیادی عقائد
* اسلام میں بنیادی حقوق
* اسلام کی سچائی اور سائنس کے اعترافات
* اسلام پر 40 اعتراضات کے عقلی و نقلی جواب
* اسلام ہی ہمارا انتخاب کیوں؟
* میں توبہ تو کرنا چاہتا ہوں لیکن!
* جنت میں داخلہ، دوزخ سے نجات

راہ حق سیریز

مسلمانوں کی عملی زندگی میں مسنون انقلاب برپا کرنے والی کتب کا دعوتی، مستند اور جامع سیٹ

* ترجمہ و تفسیر تیسواں پارہ
* تجلیات نبوت
* ارکانِ اسلام و ایمان
* مسنون نماز اور روزمرہ کی دعائیں
* اسلام کے احکام و آداب
* فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراطِ مستقیم کے تقاضے
* اسلامی آدابِ معاشرت
* حقوق و فرائض
* انسان......اپنی صفات کے آئینے میں
* دعوتِ حق کے تقاضے
* لباس اور پردہ

فکر و عقیدہ کی گمراہیاں
اور
صراطِ مستقیم کے تقاضے

اسلام مسلمانوں سے صرف دو باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس کے دل کا یقین ٹھیک ہو، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو اپنا معبود، مسجود، مقصود، مشکل کشا اور حاجت روا نہ مانے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس کی پوری زندگی حسن عمل کی آئینہ دار ہو، یعنی وہ ہر قسم کے شرک و بدعت سے بالکل پاک ہو، اور اُس کے ہر کام اور اقدام میں سنت رسول اللہ ﷺ کا نور چمک رہا ہو۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسلام کی ان مایۂ ناز ہستیوں میں سے ایک ہیں جو ہمارے دین، ہمارے علوم، ہماری تہذیب اور ہماری تاریخ کا وقار اور اعتبار تھے۔ اُنھوں نے ایک طرف تاتاریوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور دوسری طرف اپنے علوم عالیہ سے مسلمانوں کی فکری صحت و سلامتی کا عظیم الشان کام انجام دیا اور طرح طرح کی فکری گمراہیوں اور بدعتوں کا سدباب فرمایا۔ امام موصوف رحمہ اللہ کی معروف کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" ان کی انھی نادر خوبیوں کا مرقع ہے۔ یہ کتاب ایک طرف اللہ کی ذات عالی پر ایمان کو مضبوط بناتی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو ہر قسم کی فکری لغزشوں اور عملی گمراہیوں سے خبردار کر کے ان پر قرآن و سنت کی راہ روشن کر دیتی ہے۔ اس کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر "دارالسلام" اسے اُردو کے قالب میں "فکر و عقیدہ کی گمراہیاں اور صراط مستقیم کے تقاضے" کے عنوان سے پیش کر رہا ہے۔ زندگی کو صحیح معنوں میں اسلام کے مطابق بنانے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ISBN: 9960-9822-7-0
9 789960 982274

PRINTED IN CHINA - 07